مـرّوجه بیمه کی شرعی حیثـــیت

مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل

فکرونظر، فروری ۱۹۸۴ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن جناب عبدالمالک عرفانی صاحب نے بیمه کی شرعی حیثیت سے متعلق اپنے خیالات پیش کئے تھے ۔ جناب مفتی سیاح الدین کاکا خیل صاحب نے عرفانی صاحب سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے جو قارئین کے استفادے کیلئے پیش خدمت ہے ۔

بیمه کے جواز کے لئے زیاده زور دے کر یه بات کہی جاتی ہے که بیمه اس دور میں باهمی تعاون و تکافل ، کا ایک مفید کاروبار ہے جس سے غریبوں کو فائده پہنچتا ہے ۔ لیکن یوں کہنے اور لکھنے کو جو کوئی جو چاهے کہے اور جو چاهے لکھے ۔ لیکن درحقیقت بیمه کا یه موجوده رائج الوقت نظام تعاون و تکافل کی نیت سے نہیں ، بلکه یه سرمایه دارانه ذهن رکھنے والوں کی ایک نئی فریب کاری ہے جس کے ذریعے سے وه لالچ دے کر اور سبز باغ دکھا کر لوگوں سے سرمایه اکٹھا کرتے هیں اور دوسروں کے سرمایوں سے نفع اندوزی کرتے هیں ۔ سود پر چلاتے هیں اور سود هی کے ذریعے غریبوں کا خون چوستے هیں۔

بیمه کے جواز شرعی کے مدعی حضرات زیاده زور اس نکته پر دیتے رهتے هیں که بیمه کا یه کاروبار اس نئے دور کی ایجاد ہے قدیم کتب فقه میں اس کا کوئی ذکر هی نہیں ہے ۔ ایسا کاروبار جب پہلے تھا هی نہیں تو قدیم فقہاء نے اسے کب ناجائز لکھا ہے ۔ آئمه فقه اور

فقہاء کرام کے ہاں کی کسی بھی فقہی کتاب میں اس کے حرام و ممنوع ہونے کا حکم موجود نہیں ہے۔ لہذا یہ جائز عقد اور حلال و طیب کام ہے یہ صحیح اور قابل تسلیم ہے کہ قدیم فقہاء کے ہاں اور کتب فقہ میں رائج الوقت بیمہ کا اور اس کے بارے میں عدم جواز کے حکم کا کوئی ذکر نہیں لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ پھر کاروبار کی یہ موجودہ صورت شرعاً جائز بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ عقد بیمہ جن عناصر سے مرکب ہے۔ ان میں سے ہر عنصر پر انہوں نے ہر کتاب میں بحث کی ہے۔ اور ان عناصر میں سے ہر عنصر پر بحث کے نتیجے میں یہ بات خود بہ خود ثابت ہو جاتی ہے کہ بیمہ کا موجودہ کاروبار ان حرام اجزاء کی وجہ سے حرام اور ناجائز ہے۔ اس بات کو ذہن نشین کرنے کیلئے ایک مثال سے اصل حقیقت سمجھنا چاہیئے۔ اگر آج ایک مرکب دوا ایسی بنائی جائے جس میں سنکھیا ہو۔ یا کُشتہ کچلہ ہو، دھتورہ ہو اور میٹھا کرنے کیلئے اس میں کھانڈ اور شہد بھی ملایا گیا ہو اور بہت خوش رنگ و خوش منظر ہو۔ ایک شخص وہ کھانے لگے۔ دوسرا اس کو روک رہا ہو کہ بھائی یہ مت کھاؤ۔ یہ زہر ہے، مہلک ہے اس کو کھلانے والا شخص اٹھ کر کہے کہ اس کو کھا لینے سے کیوں منع کرتے ہو۔ یہ مرکب خوش رنگ و لذیذ میٹھی دوا تو ہماری نئی ایجاد ہے۔ کسی بھی طب کی کتاب میں اس کا تو نام ہی نہیں ہے کہ وہاں لکھا ہو کہ اس نام کی دوا زہر ہے مہلک ہے۔ چونکہ اس مرکب کے بارے میں کسی بھی طبیب نے قدماء میں سے کچھ کہا نہیں ہے نئی چیز ہے۔ لہذا کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ اس کی حلاوت سے لطف اندوز ہونا چاہیئے۔ اس شخص کو جواب میں یہی کہا جائے گا کہ برادر محترم،

اس مرکب کے اجزاء میں سے تین اجزاء ایسے ہیں کہ وہ زہر اور مہلک ہیں ۔ اطباء نے بالاتفاق سنکھیا کو ، کچلے کو ، دھتورے کو زہر اور خطرناک لکھا ہے ۔ چینی یا شہد کے ملانے سے مٹھاس تو آ جاتا ہے ۔ مگر اس سے زہر کا اثر تو دور نہیں ہوتا ۔ لہذا اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے ہم اس کو زہر ہی کہیں گے اور لوگوں کو اس کے کھا لینے سے روکیں گے ۔ اگرچہ بعینہ اسی قسم اور اس نام کے کسی مرکب کا ذکر کتب طب میں نہ بھی ہو ۔

بیمہ کے عقد کو نئی ایجاد کہہ کر محض جدید ہونے کی بناء پر جائز سمجھنا اور دوسروں کو یقین دلانا کہ اس دلیل سے وہ جائز ہے ایک بہت بڑا مغالطہ ہے جو کہ دیا جارہا ہے ۔ بلکہ اس دور کے تمام ناجائز اور حرام عقود اور اشیاء کو جائز اور حلال قرار دینے کیلئے عموماً یہی مغالطہ دینے والی دلیل دی جاتی ہے کہ یہ ایک نئی ایجاد ہے فقہاء نے اس کا کوئی حکم بیان نہیں کیا لہذا جائز ہے ۔ اس موقع پر بہ طور لطیفہ ایک بات عرض کروں ایک ,, مولوی صاحب ،، یا ,,نیم ملا،، تھے انہوں نے لوگوں کو یہ فتویٰ دیا تھا کہ میٹر کے بغیر بجلی کے تار سے تار لگا کر گھر میں بجلی لانا اور اسے روشنی وغیرہ سارے کاموں کے لئے استعمال میں لانا جائز ہے اور ان کے اس ,,فتوے،، کی وجہ سے کئی لوگوں نے یہ کام شروع کیا ۔ میں نے ان کو روکا کہ یہ استعمال کرنا ناجائز اور حرام ہے اور یہ چوری ہے ۔ انہوں نے ,,مولوی صاحب ،، کے فتوے کا حوالہ دیا ۔ اس سے مجھے اور تکلیف ہوئی کہ ایک حرام کو فتویٰ شرعی کی آڑ میں حلال سمجھ کر اس کا ارتکاب کیا جا رہا ہے ۔ میں نے ,, مولوی صاحب ،، سے کہا کہ آپ نے یہ کیا ارشاد فرمایا ہے ۔ وہ کہنے لگا کہ بجلی نئے زمانے

کی ایجاد ہے۔ کسی حدیث میں ، فقہ کی کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ۔ یہ کسی کتاب میں بھی لکھا ہوا آج تک مجھے نہیں ملا کہ بجلی کی بھی چوری ہوتی ہے اور وہ حرام ہے اور جب کسی کتاب میں بھی اس کو حرام نہیں لکھا تو اشیاء میں اصل اباحت ہے تو جس طرح بہتے دریا سے گھڑا بھر کر لے جانا اور اس پانی کا استعمال کرنا جائز ہے اسی طرح تاروں میں سے گذرتی ہوئی بجلی سے تار کے ذریعے اپنے گھر بجلی لانا جائز اور حلال ہے اور بڑے زور اور تحدی کے ساتھ مجھے کہا کہ آپ اس کو حرام کہتے ہیں تو فقہ کی کوئی کتاب نکال کر مجھے دکھا دیجیئے کہ یہ حرام ہے۔ وہ بھی عصر حاضر کے ,, مجتہد مولوی صاحب ،، تھے ۔ اس اجتہاد کے جواب میں میں ان کو کس طرح سمجھا سکتا تھا ۔ تو یہ مقالہ پڑھ کر مجھے یہ واقعہ یاد آیا ۔

نئی ایجاد کے نام سے اور کتب فقہ میں بعینہ اسی نام کی کسی چیز کے مذکور نہ ہونے اور حرام قرار نہ دینے سے اگر جواز ثابت ہو سکے تو اگر کوئی دوا ساز کمپنی آج کوئی ایسا شربت تیار کرے ۔ جس میں غالب جزء تو شراب (خمر) ہو اور کچھ اجزاء خواہ وہ مباح ہوں اور بھی ملا دیئے ہوں۔ بہت خوش رنگ اور جاذب نظر ہو اور اس کا نام مفرح القلوب رکھا ہو ۔ اس کے پینے اور استعمال میں لانے کا مسئلہ پیش ہو جائے تو ایک شخص جس کو اس کی اصل حقیقت معلوم ہوگی وہ کہے گا کہ اس ,,مفرح القلوب شربت ،، کا پینا حرام ہے اور لوگوں کو پلانے والا کہے کہ یہ شربت تو اب دو سال ہوئے ہیں کہ اس کمپنی نے ایجاد کیا ہے بہت ہی خوش مزہ اور خوش رنگ ہے ، بہت سے لوگ اسے پیتے ہیں اور ان کو ایک خاص

قسم کی فرحت ، بے غمی اور سرور کی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ فقہ کی کسی کتاب میں تو اس کا نام ہی نہیں ہے نہ آج تک اس شربت مفرح القلوب کے نام سے کسی فقیہ و مجتہد نے بحث کی ہے تو پھر حرام کیوں کہتے ہو ۔ مگر اس کو سمجھایا جائے گا کہ شراب کی ملاوٹ کی وجہ سے اس کا پینا حرام ہے۔ بعض اجزاء کا مباح ہونا۔ خوش منظر و خوش مزہ ہونا یا کسی نئی کمپنی کی نئی ایجاد اور مفرح القلوب نام ہونا اس کے لئے وجہ جواز نہیں بن سکتی ۔ اس میں شراب ہے اور وہ حرام قطعی ہے تو اس کی وجہ سے یہ شربت بھی حرام ہے۔

یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ,, زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ جو نئے عقود سامنے آئیں گے شریعت ان کو اپنا سکتی ہے ،، اگر ہر نئی دوا اس کے اجزاء کی تحقیق کئے بغیر کہ کہیں اس میں زہر نہ ہو مخالف اثر کرنے والا کوئی جزء نہ ہو ۔ مطلقاً اپنائی نہیں جا سکتی یا ہر شربت یہ تحقیق کئے بغیر کہ اس میں خمر تو شامل نہیں یا پیا نہیں جا سکتا ۔ بلکہ اچھی طرح تحقیق و اطمینان کے بعد وہ دوا کھائی یا شربت پیا جا سکتا ہے اسی طرح زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ جو نئے عقود سامنے آئیں گے ۔ شریعت مطہرہ نصوص قرآن و سنت اور مسلمہ قواعد و ضوابط اور اصول فقہ کی روشنی میں ان عقود کے سارے اجزاء اور ان کی پوری حقیقت پر غور خوض کرنے اور تحقیق کے بعد اگر ان کو جائز سمجھے گی تو ان کو جائز قرار دے گی اور اپنائے گی ۔ اور مسلمانوں کو ان سے روکے گی نہیں ۔ لیکن اگر فقیہانہ غور و خوض اور علمی تحقیق و تدقیق کے بعد یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ نئے عقود جن اجزاء سے مرکب ہیں اور جن کی موجودہ

ہیئت بنی ہے وہ نصوص قرآن و سنت اور فقہی اصول و قواعد کی رو سے ممنوع و ناجائز ہیں تو شریعت ان کو ناجائز قرار دے گی اور رد کرے گی اور حاملین شریعت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان عقود سے روکیں گے ۔ ان کا غیر مسلم معاشروں میں رواج پذیر ہونا اور عام طور سے بازاروں ، منڈیوں میں ان کا زیر استعمال ہونا اور ترقی یافتہ دور کا ترقی یا فتہ عقد ہونا کوئی وجہ جواز نہیں ہوگی ۔ یہ جو دعویٰ کیا جاتا ہے کہ شریعت اسلامیہ ہر زمانے کے مسائل حل کرتی ہے ،، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ،، تمام ازمنہ و اماکن کے تمام احوال و ظروف کے تقاضوں کے پیش نظر اس میں تبدیلی قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے ۔ کیونکہ اس صورت میں تو شریعت اسلامیہ کا اپنا کوئی مستقل مقام نہیں رہے گا ۔ اس کے اپنے کچھ اصول و ضوابط نہیں ہوں گے ۔ بلکہ اس کی حیثیت ایسی بے بنیاد اور کمزور ہو جائے گی کہ ہوا کا کوئی جھونکا ادھر سے آئے تو ادھر اڑ کر چلی جائے اور پھر کوئی جھونکا ادھر سے آئے تو ادھر اڑ کر آئے۔

وہ ایک موم ہو جو ہر قالب میں بہ آسانی ڈھل سکے ۔ اس کا کام بس زمانہ سازی ہو ۔ اس میں زمانہ ستیزی کی اہلیت بالکل نہ ہو ۔ وہ ایک زمانے میں ایک چیز کو تو حرام کہے اور دوسرے زمانے میں اسی چیز کو حلال طیب مان جائے ۔ ایک ملک میں تو کسی چیز کے استعمال کو شرعی دلائل کے ساتھ ممنوع قرار دے اور دوسرے ملک میں یہی شریعت اپنی ان دلائل کو توڑ کر مروڑ کر دوسری دلیلوں سے اس کو کارثواب ثابت کرے ۔ بلکہ اس دعوے کا اصل مطلب یہ ہے کہ ہر زمانہ میں کوئی بھی نئی صورت پیش آ جائے تو شریعت اپنے اٹل اور مستقل اصول و ضوابط کے مطابق اس کے بارے میں جواز یا

عدم جواز کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ اس کے بارے میں غور کرکے دیکھا جائے گا کہ ان اصول و ضوابط اور قواعد کلیہ کی روشنی میں اگر وہ جائز اور قابل قبول ثابت ہو تو محض اس بناء پر کہ وہ ایک نئی صورت ہے نصوص میں اس کا صریحاً ذکر نہیں ہے شریعت اس کو رد نہیں کرے گی۔ یقیناً اسے اپنائے گی بلکہ اپنے ماننے والوں کو یہ حکم دے گی کہ وہ اس کو مزید ترقی دیں اور اپنے معاشرہ میں عام کرکے اس کے فوائد حاصل کریں۔ لیکن اگر اس نئی صورت کے بارے میں غور و خوض ہوا اور پوری تحقیق و وتدقیق کے بعد یہ معلوم ہوا کہ وہ شریعت کے مستحکم اصول و ضوابط کے مطابق جائز نہیں تو یقیناً اسے رد کرے گی۔ اسے قبول کرنے اور اپنانے سے انکار کرے گی۔ اور حاملین شریعت پر یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانوں کو اس نئی صورت اختیار کرنے اور استعمال میں لانے سے بالکلیۃ روکنے کی کوشش کریں۔ مگر اس نئی صورت کو قبول نہ کرنے اور اس کے اپنانے سے انکار پر جمود نہ ہوگا۔ بلکہ حاملین شریعت مطہرہ شرعی مسلمہ اصول و قواعد کے مطابق اس کی متبادل کوئی اور ایسی صورت سوچ کر تجویز کریں گے۔ جس سے اس نئی صورت اور نئے عقد کے فوائد و منافع جو بیان کئے جاتے ہوں وہ تو احسن طریقہ سے حاصل ہو سکیں اور وہ ان مضرات اور نقصانات سے پاک ہوگی۔ جن کی بناء پر اس نئی صورت کو شریعت نے ناجائز اور ممنوع قرار دیا ہو یعنی اصل دعویٰ یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ کے نصوص اور ان سے مستنبط قواعد و کلیات میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ ان کو پیش نظر رکھ کر ہر زمانہ اور ہر ملک کے احوال وظروف کے مطابق ایک معاشرہ کی جائز ضروریات پورا کرنے کے لئے جائز صورتیں تجویز کی جا سکتی ہیں۔

اگر کسی دوسرے نے ایسی جائز صورت تجویز کی ہے تو چونکہ وہ درحقیقت شریعت کے ان قواعد و کلیات اور نصوص کی بناء پر جائز ہے تو یہ اسے قبول کرتی اور اپنا لیتی ہے۔ کبھی بھی محض اس لئے نہیں چھوڑتی کہ یہ اوروں کی تجویز کردہ ہے۔ بلکہ اگر وہ ,, کلمة الحکمة ،، میں شامل ہو سکتی ہے تو وہ یقیناً ضالة المؤمن ،، ہے۔ اور فہواحق بہا کی بناء پر اس کو متاع گم گشتہ سمجھ کر فوراً لے لیتی ہے۔لیکن اگر کسی ضرورت کے پورا کرنے کیلئے یا کسی طرح فائدہ یا آرام پہنچانے کیلئے دوسروں نے اپنی طرف سے جو صورتیں تجویز کی ہیں وہ شریعت کے اصول و کلیات کی رو سے جائز ثابت نہیں ہو سکتیں تو حاملین شریعت ان کو یکسر چھوڑ کر خود اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے کوئی جائز صورت شرعی اصول کے مطابق تجویز کرتے ہیں ۔ شریعت اسلامیہ میں یقیناً جمود نہیں ۔ مگر جمود نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نئی جائز صورتوں کو اور نئے نئے عقود کو جو جائز ہوں قبول کیا کرتی ہے۔

جس طرح مسلمانوں نے قدیم زمانوں میں قرآن و حدیث کی تعلیمات کی رو سے محرمات کو حرام سمجھا اور ان سے اجتناب کیا۔ اسی طرح مسلمانوں کو اس جدید دور میں بھی اور آئندہ آنے والے ادوار میں بھی اسلامی تعلیمات کی رو سے محرمات کو حرام سمجھ کر ان سے ضرور اجتناب کرنا ہوگا ۔ مثلاً سود و قمار دونوں حرام تھے اور اب بھی حرام ہیں اور تاقیامت حرام رہیں گے۔ زمان و مکان کے بدل جانے سے حرام و حلال کے احکام نہیں بدل جاتے ۔ آج کل جو عام طور پر یہ کہا جا رہا ہے کہ جدید سائنسی دور میں احکام شرعی میں اجتہاد کرنا چاہیئے اور کہنے والے کا مطلب عموماً یہ ہوتا ہے کہ

اس دور میں یورپ و امریکا سے جو کچھ بھی درآمد ہو ، بلاتحقیق کہ اس کی اصل حقیقت اور نوعیت کیا ہے بس فوراً ہی اس پر علماء کرام اسلام کا ٹھپہ لگاتے چلے جائیں کہ یہ بھی جائز ، یہ بھی حلال یہ بھی کارثواب اور اس طرح ٹھپہ لگا لگا کر ہر چیز کو جائز کہتے چلے جانے کو کہا جاتا ہے کہ یہ ،، اجتہاد،، ہو رہا ہے۔ اور اگر کوئی متقی و خدا ترس اور عالم دین ایسے درآمدشدہ مال کو پوری تحقیق و تدقیق کے بعد شرعی دلائل کی بناء پر ناجائز یا حرام کہے تو بگڑ کر کہا جاتا ہے کہ اس دور کے علماء بڑے دقیانوسی ہیں ، لکیر کے فقیر ہیں ۔ اجتہاد نہیں کرتے ۔ انہوں نے اجتہاد کا دروازہ بند کرکے اسلام جیسے وسیع دین کا دائرہ تنگ کر دیا ہے ۔ حالانکہ اجتہاد کرکے اور اجتہاد ہی کے نتیجے میں علماء نے کہا ہوتا ہے کہ یہ حرام ہے کیونکہ اجتہاد کی تعریف تو یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنی سعی و کوشش کرکے اور ذہنی قوتوں سے کام لے کر یہ معلوم کیا جائے کہ اس معاملہ میں جس کا حکم قرآن و حدیث میں صریحاً منصوص نہیں ہے شرعی اصول و قواعد کی رو سے کیا حکم ہے اور حکم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ معاملہ حلال اور جائز ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حرام اور ناجائز ہے ۔ اگر اس سعی و کوشش اور پورے غور و خوض کے بعد ان محقق علماء نے اس دور کے کسی نئے معاملے کے بارے میں یہ معلوم کیا ہو کہ یہ حرام ہے تو یہ اجتہاد کیوں نہیں ہے اور اس اجتہاد کو کیوں قبول نہیں کیا جاتا ۔ کیا اجتہاد صرف وہ ہوگا کہ ہر معاملے کو جائز اور حلال ہی کہتے چلے جائیں ۔ علماء کرام سے اجتہاد کا تقاضا کرنے والے حضرات اس بات کو سمجھیں کہ اجتہاد کے نتیجے میں کبھی حکم جواز کا ہوتا ہے کبھی عدم جواز کا۔

اور اس دور میں علماء نے بہت سی نئی صورتوں کو جائز بھی کہا ہے اور بہت سی نئی صورتوں کو ناجائز بھی کہا ہے اور دونوں باتیں انہوں نے پوری علمی تحقیق اور پوری اجتہادی قوت صرف کرکے کی ہیں ۔ یہ شکوہ بے جا ہے کہ علماء اجتہاد نہیں کرتے ۔

ہمارے ملک کے قانون دان حضرات بھی عجیب متضاد رویہ رکھتے اور متضاد باتیں کیا کرتے ہیں ۔ ان کا اپنا عمل اور طریق کار تو یہ ہے کہ اگر ان کے سامنے کوئی ایسا مقدمہ پیش ہوتا ہے جس کا انہیں فیصلہ کرنا ہے یا ایسے مقدمہ میں کسی فریق کی وکالت کرتے ہیں جس میں ماخوذ شخص قانونی مجرم یا غیر مجرم قرار دینے کے بارے میں کوئی صاف صریح اور واضح عبارت کتاب قرآن میں نہیں ہوتی ، بالکل ایک نئی نوعیت کا واقعہ ہوتا ہے ۔ قانون کی مرتب دفعات میں اس کا صریحاً کوئی ذکر نہیں ہوتا تو پھر ایسی صورت میں وہ حضرات اپنے قانونی ذہن اور قانونی تجربہ و مہارت سے کام لے کر یہ کوشش کرتے ہیں اور یہ ان کا اجتہاد ہوتا ہے کہ قانون کی کتابوں میں جتنی دفعات موجود اور ان کے سامنے ہیں ۔ ان کو پیش نظر رکھ کر ،، ان کی چارڈیواری میں لاکر کسی نہ کسی خانے میں منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں ،، اگر ان دفعات کا اس طرح انطباق ہو سکے کہ وہ مجرم ثابت ہو تو اس شخص کو مجرم قرار دیتے ہیں اور کسی طرح انطباق نہ ہو سکے تو غیر مجرم قرار دے کر اس کو چھوڑ دیتے ہیں ۔ لیکن اگر جدید دور کا ایک نیا معاملہ سامنے آئے اور علماء دین کو یہ فیصلہ کرنا ہو کہ یہ جائز ہے یا ناجائز حلال ہے یا حرام اور اس کے بارے میں یہ علماء و فقہاء یہ کہیں کہ مطلقاً اور فوراً اس کو حلال اور جائز ابھی مت کہو ۔ ضروری ہے کہ قدیم فقہ

کی ان دفعات کو جو قرآن و حدیث سے ائمہ مجتہدین نے مستنبط کرکے لکھی ہیں پیش نظر رکھو اور اس معاملہ کو ان قانونی دفعات کی چاردیواری میں لاکر انطباق کی کوشش کرو تو یہ حضرات شور مچاتے ہیں کہ اس نئے درپیش معاملہ کو ,, قدیم فقہاء کے اصول و کلیات کی چاردیواری میں کیوں لاکر انطباق کی کوشش کی جاتی ہے،

بس علماء کو فوراً یہ کہہ دینا چاہیئے کہ یہ ایک نئی صورت ہے کتاب و سنت میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے اس کی کوئی صریحاً ممانعت نہیں آئی ہے لہذا یہ بالکل جائز اور حلال معاملہ ہے۔ مسلمان بلاکھٹکے اس کو عمل میں لایا کریں۔

بیمہ کو جائز بلکہ امر مستحب یا واجب ثابت کرنے کے لئے چند قرآنی آیات سے نہایت عجیب و غریب استدلال کیا گیا ہے قرآن مجید میں آیت لاخوف علیھم ولاھم یحزنون ۔ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ ساتھ بار بار ذکر کیا گیا ہے اور قریش مکہ کے بارے میں بہ طور احسان وآمنھم من خوف فرمایا گیا ہے تو ان آیات کو پیش کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خوف سے امن دلانا شریعت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔ اور بیمہ پالیسی حاصل کرنے کے بعد مالی خوف ختم ہو جاتا ہے۔ لہذا قرآن مجید کا منشا یوں پورا ہوتا ہے کہ بیمہ کرایا جائے اور بیمہ کرنا منشا خداوندی کی تعمیل و تکمیل ہے۔

حالانکہ ان آیات کا کوئی تعلق اس مفروضہ بے خوفی سے نہیں ہے جو بیمہ کرانے کی صورت میں بیمہ دار کو مضمون نگار کے خیال کے مطابق حاصل ہوتی ہے۔ جتنی آیات ہیں وہاں ایمان اور عمل صالح پر لاخوف علیھم ولاھم یحزنون کا ترتب آخرت میں ہے۔ وہاں مراد یہ ہے کہ مؤمنین صالحین کو قیامت کے دن جب کہ دوسرے لوگ

خوف و حزن میں مبتلا ہوں گے کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔
. اس کا تعلق دنیا سے ہے ہی نہیں ۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ اتباع ھدیٰ اور ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے یہاں بھی اطمینان قلب حاصل ہو جاتا ہے تو یہ اطمینان قلب جو الابذکر اللہ تطمئن القلوب میں تو بیان کیا گیا ہے یقیناً اس نوعیت کا یقین نہیں جو مضمون نگار کے قول کے مطابق بیمہ دار کو حاصل ہوتا ہے کہ اب تو میں ماہوار قسط ادا کر رہا ہوں اور مر جاؤں گا تو صرف چار ہزار کی قسطیں ادا کرنے کے باوجود میرے بچوں کو مثلاً بیس ہزار مل جائیں گے ۔ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ھدیٰ تو یہ ہے ۔ ایمان اور عمل صالح تو یہ ہے کہ آدمی ربوٰ اور قمار سے بچا رہے اور یہاں کہا جا رہا ہے کہ سود و قمار کیا کرو تو خوف و حزن نہیں ہوگا اور خداوند تعالیٰ کا منشا اس طرح پورا ہوگا گویا سود و قمار ھدی بھی ہے ۔ ایمان کا تقاضا بھی ہے اور عمل صالح بھی ہے ۔ اگر لاخوف علیھم ولاھم یحزنون کا مطلب اس طرح خوف کا زائل ہونا ہو تو بیمہ سے بڑھ کر اس قسم کا خوف تو مہاجنی سود خواری سے باقی نہیں رہتا ۔ وہ مثلاً ہزار روپیہ سود پر دے کر ۲۰ فی صدی کے حساب سے ,, بلاخوف و حزن،، ہر ماہ دو سو روپیہ وصول کرتا رہے گا ۔ اصل بھی محفوظ ہے اور موت سے پہلے اپنی زندگی میں کما رہا ہے اور عیش کر رہا ہے ۔ ,, خوف و حزن ،، قریب بھی نہیں آتا ۔ اور سودی کاروبار کے ذریعے شریعت کے اس منشا اور مقصد کو پورا کر رہا ہے ،، حیرانی ہوتی ہے کہ ایک باطل کو حق ثابت کرنے کیلئے قرآن مجید کی آیات کو کس طرح بے موقع استعمال کیا جا رہا ہے ۔ تلعب بالقرآن کی یہ ایک افسوس ناک مثال ہے ۔ اسی طرح وآمنھم من خوف سے مراد تو

قریش مکہ کو اپنا یہ احسان یاد دلانا ہے کہ اس کعبۃ اللہ کی مجاورت کی وجہ سے مکہ مکرمہ کے ان باشندوں کو تجارت کرتے وقت کسی موسم میں بھی رھزنی اور قتل و قتال کا خوف نہیں ھوتا اور عرب کے تمام قبائل بیت اللہ کی وجہ سے قریش مکہ کا خصوصی لحاظ کرتے ھیں ۔ جس طرح ان آیات سے ایک بالکل غلط استدلال کرکے بیمہ کو جائز ثابت کیا گیا ہے ۔ اس کے مقابلے میں اگر کوئی شخص قرآن مجید کی آیت سے یوں استدلال کرے ۔

کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔ ولنبلونکم بشیئ من الخوف والجوع : اس آیت میں صابرین کو بشارت اخروی سنانے اور ان کے درجات بلند کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خوف و جوع اور نقص انفس و اموال میں مبتلا کرتا ہے ۔ لہذا شریعت کا مقصد و منشا یہ بھی ہے کہ خوف وجوع ضرور ھو ، لہذا بندوں کو چاھیئے کہ ایسے کام ضرور کیا کریں جس کے نتیجے میں خوف بھی پیدا ھو بھوک بھی ستایا کرے ۔ اھل و عیال کی بیماری اور موت بھی واقع ھو اور نقص اموال و ثمرات بھی ھو تاکہ شریعت کا منشا پورا ھوتا رھے "

تو کیا اس استدلال کو جو قرآن کی ایک آیت کی بنیاد پر اس پہلے استدلال کی طرح کیا جا رھا ہے صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے "اور بیمہ کے ذریعے بے خوف ھونے " کو منشا خداوندی کے خلاف سمجھ کر بیمہ قابل اجتناب قرار دیا جائے گا کیونکہ اس طرز استدلال کی رو سے تو اللہ چاھتا ہے کہ خوف ضرور ھو اور بیمہ کرنے والا خوف کو زائل کر رھا ہے ۔ حیرانی ھوتی ہے کہ بیمہ کے جواز کے لئے یہ استدلال کس طرح ذھن میں آیا کیا یہ یحرفون الکلم من بعد

مواضعہ کے مطابق ان آیات کی معنوی تحریف نہیں ہے، اور پھر مزید حیرانی اس پر ہوتی ہے کہ کچھ "دانشوروں" نے اس پر داد بھی دی ہے۔

بیمہ کے جواز کے لئے مقالہ نگار بھی علماء کی طرح مجبور ہوا ہے کہ بیمہ کو "فقہاء کے قواعد کی چاردیواری میں داخل" کرنے کی کوشش کرے۔ اگرچہ نتیجہ کے اعتبار سے یہ سعی لاحاصل ہے اور بیمہ فقہاء کے قواعد کی چار دیواری میں داخل نہیں ہو سکتا۔

عرفانی صاحب نے غرر کی بحث بھی بلا ضرورت چھیڑی ہے۔ اسی طرح کبھی اس کو کفالہ کی صورت قرار دے کر فقہی قواعد کا سہارا لینے کی گنجائش پیدا کی ہے کبھی اس کو بیع سلم کے مماثل قرار دے کر جواز کا حکم لگایا ہے، کبھی اس کو عقد معاوضہ کہہ کر جائز عقد بنانے کی تاویلیں ڈھونڈیں۔ یہاں بات بنتی نظر نہیں آئی تو پھر اس کو عقد تبرع کہہ کر بیمہ کو تعاون و تکافل کا ایک کار خیر ثابت کرتے ہیں۔ بیمہ پر بیع الدین بالدین کا اعتراض کسی نے نہیں کیا خواہ مخواہ اس کاذکر چھیڑ کر جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ یہ تمام بالکل غیر متعلق باتیں ہیں۔ ناواقف اور انجان قارئین کو مرعوب کرنے کیلئے کہ جواز بیمہ کیلئے دلائل کا انبار لگایا گیا ہے خواہ مخواہ مضمون کو طول دیا گیا ہے۔ ان سارے امور کا تفصیلی جواب دیا جا سکتا ہے مگر اس طرح بلاضرورت یہ جوابی مضمون بھی طویل ہو جائے گا۔ درحقیقت جن علماء کرام نے موجودہ بیمہ کے اس کاروبار کو حرام اور ناجائز قرار دیا ہے۔ ان میں سے کسی نے بھی اس کو بیع غرر یا کفالہ اور الدین بالدین میں لے جانے اور ان وجوہ سے اس کو ناجائز قرار دینے کی کوشش نہیں کی ہے۔ نہ

انہوں نے بیع و کفالہ کے قواعد و مسائل کا اس پر انطباق کیا ہے اور یہ انطباق نہ ہونے کی بناء پر جب فقہاء کے فقہی قواعد کی چار دیواری میں بیمہ داخل نہ ہو سکا تو محض اس لئے کہا کہ یہ بیمہ حرام ہے۔ بلکہ وہ تو ابتداء سے اس کو صاف و صریح سود یا سود و قمار کا معاملہ سمجھتے رہے ہیں اور چونکہ شرعی قطعی دلائل کی بناء پر سود و قمار حرام اور ناجائز ہیں لہذا بیمہ ناجائز ہے۔ اس لئے فقط اس پر بحث ہونی چاہیئے کہ بیمہ میں سود و قمار کا عنصر ہے یا نہیں ہے۔

ہم پہلے بیمہ زندگی کی صورت لیتے ہیں۔ ایک شخص کسی بیمہ کمپنی سے معاہدہ کرتا ہے کہ مثلاً بیس سال تک میری زندگی کا بیمہ اس طرح ہو کہ میں ماہوار مثلاً سو روپیہ قسط ادا کرتا رہوں گا۔ اگر ۲۰ سال کے اندر میری موت واقع ہوئی تو بیمہ کمپنی میرے فلاں رشتہ دار کو چالیس ہزار روپیہ ادا کرے گی۔ اور اگر ۲۰ سال پورے ہو گئے تو ۲۴ ہزار ادا کردہ رقم کے ساتھ، مثلاً ۶ ہزار روپیہ ملا کر ۳۰ ہزار روپیہ کمپنی مجھے دے دے گی۔ اس معاہدہ کے بعد وہ ہر مہینہ سو روپیہ ادا کرتا رہا۔ اب یہ بات تو بالکل واضح ہے اور کوئی دیانت دار اور صادق القول شخص اس کے خلاف اور کچھ نہیں کر سکتا کہ اس شخص نے یہ معاہدہ کرکے ماہوار سو روپیہ دینے کا اقدام اس نیت سے ہرگز نہیں کیا کہ کسی اور شخص کا اگر نقصان ہوا یا کوئی اور بیمہ دار مر گیا تو میری اس رقم سے اس کی امداد و اعانت کی جائے مجھے اس سے ہمدردی ہے اور یہ ہر ماہ سو روپیہ میں تبرعاً دے رہا ہوں اس کار خیر کا مجھے اجر و ثواب ملے گا یقیناً اس کے تصور میں بھی یہ بات نہیں ہوتی نہ یہ اس کی نیت

ہوتی ہے اور نہ کسی مرحلے پر اس نیت کا استخصار ہوتا ہے کیونکہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کے لوگ کسی مریض پر ترس کھا کر دوا کیلئے کسی بھوکے پیاسے پر رحم کھا کر کھانے پینے کے لئے کسی آفت زدہ فقیر و مسکین کو سہارا دینے کیلئے دس روپے خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے ۔ ان کے ہاں تبرع کا کوئی کھاتہ ہی نہیں ہوتا ۔ یہ معاملہ وہ اس ذہنیت کے ساتھ کرتے ہیں کہ سو روپیہ ماہوار دیتا رہوں گا تو اگر اس اثنا میں مر گیا تو بال بچوں کے لئے جس طرح اور حرام و حلال جائداد اور اموال و املاک چھوڑوں گا تو اسی طرح ان کو یکمشت ۴۰ ہزار کی خطیر رقم مل جائے گی ۔ اور اگر زندہ رہا تو میرا یہ سارا روپیہ مزید ٦ ہزار کے ساتھ مجھے بیک وقت ضرور مل جائے گا ۔ اور یہ ہر ماہ کا پس انداز ماہوار روپیہ یکجا مع اضافہ ملنے کی صورت میں مجھے عظیم مادی فائدہ پہنچائے گا ۔ اب یہ تو ہے اس معاملہ کی اصل حقیقت کوئی محض اپنی چرب بیانی یا انشا پردازی سے اس کو انسانی یا اسلامی ہمدردی و خیرخواہی کا مظاہرہ ، مصیبت زدہ لوگوں کی دستگیری اور گرتے ہوؤں کو تھامنے کی کوشش اور کارخیر سمجھے تو وہ محض فریب کاری ہے ۔ اس لئے جو شخص بیمہ کمپنی کے ساتھ اس قسم کا معاہدہ کرکے ہر ماہ سو روپیہ دیتا ہے تو سوال یہ ہے کہ اس کی حیثیت کیا ہے ۔ کیا یہ سو روپے اس کی ملکیت سے نکل کر کمپنی کی ملکیت میں ہر ماہ آ جاتے ہیں اور جتنی رقم اس کی جمع ہوتی رہے گی کمپنی اس سارے مال کی مالک ہوگی تو یہ ہر ماہ ادا کرنا تملیک مال ہے ۔ تملیک کی وجہ یا تو یہ ہوتی ہے کہ کسی مشتری نے کسی بائع سے کوئی چیز خریدی ہے اس کا ثمن اس کے ذمہ واجب الادا تھا جس کو وہ ادا کرکے بائع کو

مالک بنا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ بیمہ دار نے بیمہ کمپنی سے کوئی چیز نہ تو خریدی ہے کہ اس کا ثمن دے رہا ہے نہ آئندہ کوئی متعین شئے خرید رہا ہے کہ اس کا عوض پیشگی دے رہا ہے۔

عرفانی صاحب کبھی تو اسکو تبرع کہتے ہیں اور کبھی اس تحفظ کا معاوضہ جو اسکو اس معاہدہ کے بعد حاصل ہوا۔ یعنی یہ تحفظ اس معاہدہ میں ,,مبیع،، ہے کہ یہ بیمہ دار مطمئن ہو رہا ہے کہ مروں گا تب بھی میرا فائدہ ہے کہ بچوں کو ۴۰ ہزار مل جائیں گے اور زندہ رہوں تب بھی میرا فائدہ ہے کہ ۲۴ ہزار قسطوار دیکر یکجا ۴۰ ہزار وصول کروں گا۔ اس قسم کے تحفظ کی ذہنیت کے ساتھ باہمی تعاون و تکافل اور اجروثواب کا تصور کہاں جمع ہو سکتا ہے اور کیا کسی بھی شرعی دلیل سے اس نوعیت کے تحفظ کو جو خود غرضی اور مادہ پرستی کی ایک کریہہ صورت اور اخلاقی بیماری ہے کسی معاملہ میں مبیع قرار دیا جا سکتا ہے اور سو روپیہ ماہوار دیتے رہنے کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ بیمہ دار بلا کسی معاوضہ کے کمپنی کو ہبہ کر رہا ہے۔ لیکن شرعی اصول کے مطابق یہ ہبہ بن نہیں سکتا۔ اس لئے بھی کہ عرفانی صاحب کے قول کے مطابق یہ رقم کمپنی کو نہیں مل رہی ہے بلکہ ان لوگوں کو دی جا رہی ہے جو اس کمپنی کے بیمہ دار ہیں اور ان میں سے کوئی مقرر کردہ وقت سے پہلے مر جائے۔ اب معلوم ہی نہیں کہ ایسے لوگ کون ہیں اور کہاں ہیں اور نیز ان کی تعیین تب ہوگی جب کوئی مر جائے تو جب موہوب لہ مجہول ہوں تو شرعی قواعد کی رو سے ہبہ کب ہو سکتا ہے۔ اس طرح نہ وہ لوگ اس قسم کے مالک ہونگے اور نہ کمپنی اس رقم کی مالک بن سکے گی اور اس لئے بھی یہ ہبہ نہیں (خواہ عرفانی

صاحب اس کو بار بار تبرع لکھا کریں) کہ معاهدہ میں به طور شرط کے یہ طے ہے کہ ۲۰ سال کے اندر یہ مر جائے تو ورثاء کو ۴۰ ہزار روپیہ دینا ہوگا اور ۲۰ سال گذر جائیں اور یہ شخص زندہ ہو تو اس کو ۲۰ ہزار ملے گا ۔ تو قانونی طور پر اس معاهدہ کی رو سے کمپنی پابند ہے کہ وہ یہ عوض ضرور دے گی ۔ تو خواہ نام ھبہ ہو یا تبرع لیکن اگر شئے کی تملیک بشرط العوض ہوگی تو وہ ھبہ نہیں رہتا وہ حکماً مبادلہ ہوتا ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ تھوڑی رقم دے کر بعد میں اس سے زیادہ لینا ربوٰ ہے اور اس لئے بیمہ زندگی کا یہ معاهدہ حرام ہے۔ اور اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ ہر ماہ کمپنی کو جو سو روپیہ یہ بیمہ دار دے رہا ہے یہ کمپنی کے پاس ودیعہ ہے اور یہ تو بالکل واضح حقیقت ہے کہ کمپنی بعینہ اس رقم کو تو اپنے پاس به طور ودیعہ نہیں رکھتی بلکہ مختلف جائز و ناجائز طریقوں سے استعمال میں لاتی ہے اور اس سے اپنا کام چلاتی ہے اور یہ بیمہ دار کی اجازت اور اس کے علم کے ساتھ ہوتا ہے تو مودع اگر مودع کو ودیعہ کے استعمال میں لانے کی اجازت دے دے تو اس صورت میں وہ ودیعہ کے بجائے قرض ہو جاتا ہے تو گویا یہ رقم کمپنی کے ذمہ اس بیمہ دار کا قرضہ ہے۔ اب مثلاً فرض کیجئے پانچ سال تک مسلسل اس طرح سو روپیہ ماہوار کے حساب سے وہ شخص کمپنی کو قرض دیتا رہا اور ٦ ہزار کمپنی کے ذمہ اس کا قرضہ ہوا کہ وہ وفات پا گیا ۔ طے شدہ معاهدہ کے مطابق کمپنی نے نامزد شخص کو ۴۰ ہزار دیئے تو کیا یہ ٦ ہزار کے بدلے میں ۴۰ ہزار کی رقم جب دی گئی تو کیا یہ ۲۴ ہزار سود نہیں تو اور کیا ہے قرض پر اس اضافے کو سود کے سوا آپ اور کیا نام دے سکتے ہیں ۔ اور اگر یہ شخص ۲۰ سال تک زندہ رہا ۔ اور

کمپنی کو اس نے ماہوار سو روپیہ کے حساب سے ۲۴ ہزار قرضہ دیا ہے اور کمپنی نے اس کو ۳۰ ہزار دیدیئے تو ۲۴ ہزار قرضے پر یہ مزید ٦ ہزار روپیہ سود ہے یا نہیں ۔ یہ رقم خواہ دوسرے بیمہ داروں سے لے کر دی ہو یا کمپنی نے اپنی طرف سے دی ہو بہرحال وہ سود ہے ۔ یہ کسی کی طرف سے بھی تعاون تکافل نہیں ۔ بلکہ یہ اضافہ ابتداء ہی سے اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ یہ بیمہ دار اتنے عرصے تک ماہوار قسط کی صورت میں یا یکمشت اتنی رقم کمپنی کو بہ طور قرض دے دے ۔ تو کسی خاص موقع پر اس قرضے پر کچھ مزید رقم اس قرضے کی وجہ سے ضرور اس کو مل جائے گی اور یہ اضافہ اس کا ایک قانونی حق ہوگا ۔ کمپنی نہ دے تو عدالت کے ذریعے اس کو وصول کیا جا سکے گا ۔ کیا تبرع عدالت کے ذریعے قانونی بنیاد پر وصول کرنے کی کوئی گنجائش ہے ۔ اگر کسی نے تبرعاً دوسرے شخص سے کہا کہ میں تعاون و تکافل کے طور پر آپ کی اتنی مالی امداد کروں گا اور پھر کسی بھی وجہ سے ہو وہ مالی امداد نہیں کر سکتا تو کیا وہ شخص عدالت میں دعویٰ کرکے اس سے مال وصول کر سکتا ہے کہ اس نے مجھے ایک دفعہ یہ کہا تھا کہ تبرعاً آپ کی امداد کروں گا ۔ اور یہ جو بار بار کہا جا رہا ہے کہ بیمہ کی خوبی یہ ہے کہ یہ رقم دے کر اس کو تحفظ حاصل ہو رہا ہے اور وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ میرا دیا ہوا مال ضائع نہیں ہوگا ۔ مر جاؤں تب بھی ورثاء کو بہت کچھ مل جائے گا اور زندہ رہوں تب بھی دی ہوئی رقم سے زائد رقم مجھے مل جائیگی ۔ یہ تحفظ اور اطمینان خاطر اور اپنے مال کے بارے میں دل جمعی اس عقد بیمہ کی خوبی ہے تو یہ اگر دوسری خرابیوں سے قطع نظر اس کی خوبی ہے تو سودی کاروبار میں بھی یہی

,,خوبی،، موجود ہے۔ سود خوار بھی قرض دے کر اپنے اصل سرمائے اور مزیدبرآں کچھ اور مالی اضافے ملنے کا تحفظ حاصل کرتا ہے۔ مثلاً دس فی صد سود طے کرکے ۴۰ ہزار روپیہ کسی کو دے دیا اور تحفظ حاصل کرکے اپنے گھر میں مطمئن ہو کر بیٹھ گیا کہ سال کے بعد مجھے ۴۴ ہزار مل جائیں گے اور دو سال گذر جائیں تو مجھے ۴۸ ہزار مل جائیں گے۔ تو پھر سود کی بھی یہ خوبی مان کر سود ہی کو حلال ٹھہرایا جائے۔ دل پر ہاتھ رکھ کر پوری دیانت داری کے ساتھ یہ بات کہہ دی جائے کہ کیا بیمہ کا یہ کاروبار ان سود خواروں اور خون چوسنے والی جونکوں کی اختراع نہیں ہے۔ جو سود کو شیرمادر سمجھتے ہیں اور انہوں نے اسی سود کی ایک اور شکل اس ملمع سازی کے ساتھ ایجاد کی ہے۔ خالص انگوری شراب کے ساتھ اگر کچھ اور ملا کر اسے خوش رنگ و خوشبودار اور جاذب نظر بنا دیا جائے اور اس پر حسین لیبل ,,مفرح روح افزا،، کے نام سے لگا دیا جائے تو کیا محض اس کے رنگ و بو اور لیبل کو دیکھ کر یہ کہنا جائز ہوگا کہ اس ,, مفرح روح افزا،، کا پینا پلانا حلال ہے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس لئے کہ جاذب نظر رنگ کو دیکھ کر آنکھوں کو خاص حظ حاصل ہوتا ہے اور اس کی خاص قسم کی خوشبو سے قوت شامہ لطف اندوز ہوتی ہے اور یہ تفریح طبع اور نشاط خاطر کے لئے آزمودہ مشروب ہے بہت سے لوگوں نے جو باذوق ہیں اس کی بہت مدح و ستائش کی ہے۔ اور اس ساری قصیدہ خوانی اور مدح سرائی میں اس ام الخبائث شراب انگوری کا نام ہی نہ لیا جائے جو حقیقت حال جاننے والوں کے ہاں اصل وجہ حرمت ہے۔ یورپ و امریکہ کے سرمایہ داروں قارون صفت مداریوں نے یہ ایک ایسا

تماشا دکھایا ہے کہ اچھے اچھے عقل مند لوگوں اور دانش وروں کی عقلوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور بیمہ کی اصل حقیقت ان سے اوجھل ہو گئی ہے۔

ہیں ستارے کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

یہ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بیمہ زندگی میں قمار نہیں کیونکہ مدت بیمہ مثلاً ۲۰ سال تک زندہ رہنے کے بعد قسطوں میں ادا شدہ رقم واپس مل جاتی ہے۔ کمپنی اسے جیت کر ضبط نہیں کرتی لیکن اس بیمہ زندگی میں سود تو بہ ہر صورت ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا کہ جتنی رقم اس نے دی ہے وہ بہ طور قرض ہے۔ یہ زائد رقم قرضے پر شرط کے طور پر اضافہ دیا جا رہا ہے۔ اس نے کمپنی کو وہ رقم مضاربت کے طور پر تو نہیں دی تھی کہ کمپنی نے اس کے سرمائے سے کوئی جائز تجارت کی اور اس میں جو نفع ہوا وہ کسی متعین طے شدہ شرع کے مطابق اب سرمائے والے کو کمپنی دے رہی ہے۔ بیمہ کے اس لین دین پر مضاربت کے احکام میں سے کوئی حکم جاری نہیں ہوتا۔ یہ زائد رقم خالص سود ہی ہے۔ بار بار یہ کہا جا رہا ہے کہ بیمہ دار نے قسطوں کی یہ رقم بہ خود تبرع کمپنی کو دی ہے۔ تبرع کے معنی تو یہ ہیں کہ ایک شخص اپنی آزاد مرضی سے کسی قسم کے مادی معاوضے کے بغیر کوئی چیز کسی کو دیتا ہے۔ اس شخص پر اس چیز کے دیدینے کی کوئی شرعی اور قانونی پابندی نہیں ہوتی۔ وہ ادائیگی کسی سابقہ قانونی طور پر لازمی معاہدہ کی بنیاد پر نہیں ہوتی۔ تو بتا دیا جائے کہ کمپنی کے ساتھ عقد بیمہ ہو

جانے کے بعد اگر بیمہ دار باقی قسطیں ادا نہ کرے تو کیا یہ نہیں کہا جاتا کہ اس نے ایک ایسا معاہدہ توڑ دیا ہے جو قانوناً اس پر واجب اللزوم تھا ۔ اور کہا جاتا ہے کہ معاہدہ توڑنے اور شرائط پورا نہ کرنے اور مزید قسطیں ادا نہ کرنے کی بناء پر اس کی وہ ادا کردہ قسطیں کمپنی نے ضبط کیں ۔ اگر اقساط کی یہ ادائیگی ایک تبرع تھا تو اس کو ضبط کرنے سے تعبیر کرنا اور بہ طور سزا ضبط کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہے ۔ تبرع نہ کرنے کی بھی کوئی سزا ہوتی ہے ۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاہدہ بیمہ کی وجہ سے قانون بیمہ کی رو سے (جو ایک وضعی انسانی ساخت کا قانون ہے) اس بیمہ دار پر یہ لازم ہو گیا تھا کہ وہ ماہوار ادائیگی ضرور جاری رکھے ۔ قانونی طور پر اب وہ دینے اور نہ دینے میں آزاد و خود مختار نہیں تھا ۔ اور جب اس نے مزید قسطیں ادا نہیں کیں ۔ تو اس نے شرائط کی خلاف ورزی کی جو اس قانون بیمہ کی رو سے جرم ہے اور اس جرم کی سزائے مالی قانون بیمہ نے یہ رکھی ہے کہ وہ ادا کردہ رقم جس کے عوض میں آگے جاکر اس کو بہت کچھ ملنا تھا اور جو درحقیقت کمپنی کے ذمہ اس کا قرضہ تھا ضبط کر دی گئی ۔ اسی طرح اگر آپ یہ فرماتے ہوں کہ ۲۰ سال گذر جانے کے بعد بھی اگر یہ بیمہ دار زندہ رہا تو کمپنی جو اس کو ۳۰ ہزار روپیہ دیتی ہے وہ ادا کردہ رقم کا معاوضہ نہیں بلکہ تبرع ہے ۔ تو اس کا مطلب تو پھر یہ ہوگا کہ اگر کمپنی تبرع نہ کرنا چاہے اور اس کو کچھ دینے سے انکار کرے تو وہ ایسا کر سکے گی ۔ کیونکہ تبرع پر کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا ۔ قانونی مطالبہ کمپنی سے ہرگز نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح اگر ۲۰ سال کے اندر وہ بیمہ دار وفات پا جائے اور اس

کے نامزد شخص کو کمپنی کی طرف سے ۴۰ ہزار تبرع ہے تو وہاں بھی کمپنی کو قانوناً اس کی ادائیگی پر مجبور نہیں کیا جا سکے گا۔ تبرع کرنے میں تو پھر کمپنی آزاد و خود مختار ہوگی ۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ۔ پہلی صورت میں وہ کمپنی کے خلاف دعویٰ کرکے عدالت کے ذریعے ۳۰ ہزار روپیہ وصول کر سکتا ہے اور دوسری صورت میں نامزد کردہ شخص عدالت میں دعویٰ دائر کرکے قانون کی بناء پر لازماً ۴۰ ہزار وصول کرنے کا حق رکھتا ہے ۔ اور ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ اگر بیمہ دار یا اس کے نامزدکردہ وارث کو رقم دینے میں کسی بھی وجہ سے کمپنی پس و پیش کرتی ہو تو وہ دعویٰ دائر کرتے ہیں اور عدالت کمپنی کے خلاف قانونی فیصلہ کرکے جبراً رقم دلواتی ہے ۔ پس قانون معاہدہ بیمہ کی رو سے دونوں مجبور ہیں کہ وہ لازماً لین دین کریں ۔ تبرع کی جو حقیقت ہے وہ یہاں بالکل نہیں پائی جاتی ۔ یہ درحقیقت نقد رقم کے بدلے نقد رقم زیادہ دینے کا معاہدہ ہے اور یہی ربوٰ ہے ۔ اس کو تبرع نام رکھ کر حقیقت کو بدلا نہیں جا سکتا ۔ ,, حسن کرشمہ ساز جو چاہے سو کرے " لیکن جنوں کو خرد نام رکھ دینے سے جنوں خرد نہیں بن سکتا۔سود کو منافع نام دے کر خدا رسول اور مؤمنین کو دھوکہ دینے کی بھی بارہا کوشش کی گئی ۔ مگر منافع کہلانے سے حقیقت تو نہیں بدلی اور آخر کار یہ ملمع سازی ختم ہوئی اور بات واضح ہوگئی کہ منافع کے نام سے یہ سودی کاروبار ہو رہا ہے ۔ اب سود کو تبرع نام دیا جا رہا ہے ۔ مگر یہ دھوکہ بھی نہیں چل سکے گا اور یہ ملمع اتر جائے گا ۔

اب رہ گئی بیمہ کی دوسری صورت ۔ کہ جو بیمہ مختلف اشیاء کے ضیاع یا کسی قسم کے نقصان کی صورت میں کمپنی کی طرف سے تاوان پورا کرنے کیلئے کیا جاتا ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس بیمہ دار کو تحفظ ملتا ہے اس کا خوف زائل ہوتا ہے اور اس طرح ,,قرآنی منشاء پورا ہوتا ہے تو اس بیمہ کے ناجائز ہونے کی دونوں وجہیں ہیں ۔ سود بھی ہے اور قمار بھی ، مثلاً زید نے اپنی دکان کا بیمہ کیا ۔ دکان میں مثلاً ۲ لاکھ روپے کا سامان پڑا ہوا ہے۔ اس نے ایک سال کے لئے مثلاً پانچ ہزار روپیہ کمپنی کو دیا اور کمپنی نے وعدہ کیا کہ ایک سال کے دوران اگر آگ لگ گئی اور آپ کا سامان جل گیا تو جتنا نقصان ہو گیا وہ ہم آپ کو دیں گے اور اگر آگ نہ لگی آپ کا سامان محفوظ رہا تو یہ پانچ ہزار کمپنی کے ہو جائیں گے۔ اگر چھ مہینے کے بعد کسی وجہ سے آگ لگ گئی اور ۲۵ ہزار کا نقصان ہوا تو پانچ ہزار کے عوض یہ بیس ہزار زائد رقم کو آپ کیا کہیں گے ۔ یہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ ابتداء میں کمپنی کو ۵ ہزار روپیہ جو بیمہ دار نے دیا ہے ۔ یہ تبرع اور ہبہ ہرگز نہیں نہ کسی مبیع کا ثمن ہے بلکہ ایک قرض دیا ہے اور اب قرض پر اضافہ لے رہا ہے۔ یہ ۲۰ ہزار کا اضافہ صرف سود ہی ہے کہ اس کی کوئی بھی اور وجہ نہیں ہو سکتی ۔ یہ تبرع ہرگز نہیں کیونکہ کمپنی دینے نہ دینے میں آزاد و خود مختار نہیں قانونی طور پر وہ پابند ہے کہ وہ ضرور ادا کرے گی ۔ تبرع نہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے ۔ کہ اگر کمپنی کو یہ شبہ ہو کہ اس نے خود آگ قصداً لگائی ہے اور واقعہ میں اتنا مالی نقصان نہیں ہوا تو وہ ایسی کوئی قانونی وجہ تلاش کرکے رقم دینے سے انکار بھی کرتی ہے اور مقدمہ عدالت میں جاتا ہے۔ بیمہ دار ثابت

کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ آگ ہم نے نہیں لگائی بجلی کے تاروں وغیرہ سے لگی ہے اور نقصان ۲۵ ہزار ہی ہوا ہے اور کمپنی زور لگا کر یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ آگ اس نے قصداً لگائی ہے اور نقصان بھی اتنا نہیں ہوا ۔ اس سلسلہ میں جھوٹ کو سچ کرنے کیلئے بارہا کمپنی کے کارندوں کو رشوت بھی دینی پڑتی ہے تو کیا کوئی تبرع ایسا بھی ہوتا ہے کہ مقدمہ کرکے عدالت کے ذریعے کسی شخص کو تبرع کرنے پر مجبور کیا جائے ۔ یہاں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کمپنی تبرع نہیں کرتی بلکہ دوسرے بیمہ داروں نے معاہدہ بیمہ کرکے کمپنی کو جو رقمیں دی ہیں انہوں نے کمپنی کو اس لئے دی ہیں تاکہ کسی بیمہ دار کا نقصان ہو جائے تو ہماری ان رقموں سے اسکے نقصان کی تلافی کیا کرو ۔ کمپنی کو اس لئے عدالت کے ذریعے قانوناً مجبور کیا جاتا ہے کہ ان کی وہ رقمیں جو کمپنی کے پاس رکھی ہوتی ہیں اور اس غرض کیلئے ہیں اور ان رقموں سے نقصان کی تلافی اس کی ذمہ داری ہے تو وہ یہ ذمہ داری پوری کر دے ۔ لیکن یہ بھی ایک مغالطہ ہے جو دیا جا رہا ہے اول تو اصل حقیقت یہ ہے کہ ہر بیمہ دار جو اپنی دکان ، کار وغیرہ کسی شئے کا بیمہ کرتا ہے تو اس کے سامنے محض یہ ہوتا ہے کہ میرا نقصان ہو جائے تو ادا کردہ رقم کمپنی سے مجھے مل جائے گی ۔ مثلاً ۵ ہزار دوں گا اور ۲۵ ہزار لوں گا ۔ یہ بالکل کسی کے دل میں نہیں ہوتا کہ میری ادا کردہ ۵ ہزار سے کسی مصیبت زدہ دوسرے بھائی کی امداد ہو یعنی کوئی بیمہ دار بطور تبرع کمپنی کو وکیل بنانے کیلئے ۵ ہزار نہیں دیتا کہ کمپنی وکالۃً کسی مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ کو یہ رقم ہماری طرف سے دے جائے ۔ ہم نے پہلے

بھی لکھا ہے کہ ہر بیمہ دار قرض دیتا ہے کہ بصورت نقصان بہت زیادہ لونگا ورنہ انصاف سے کام لے کر خود سوچیئے کہ کیا ایسے لوگ کبھی ازخود کسی مصیبت زدہ ، آفت رسیدہ مریض و تنگدست اور پریشان حال کی امداد اتنی رقم دے کر کرتا ہے ؟ اس تعاون و تکافل اور تبرع کیلئے بیمہ کمپنی کو واسطہ بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی ۔ پھر یہ بتا دیا جائے کہ مثلاً ۵ ہزار کا تبرع کسی معاوضہ کو پیش نظر رکھے بغیر بیمہ دار نے کرکے اس رقم کی ملکیت کمپنی کو منتقل کر دی ہے کہ اب اس رقم کی مالک کمپنی ہے یا کمپنی کو ملکیت منتقل نہیں کی ہے کمپنی کو محض وکیل بنایا ہے کہ اگر کسی کا نقصان ہوا تو ہماری طرف سے بطور وکیل اس نقصان کی تلافی ہماری رقم سے کر دو ۔ اگر پہلی صورت ہے تو آپ کی یہ بات ختم ہوئی کہ دوسرے بیمہ داروں کی رقم ان کی طرف سے تبرعاً مصیبت زدہ کو دینا کمپنی کی ذمہ داری ہے لہذا عدالت کے ذریعے کمپنی سے مطالبہ اس لئے کیا جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں تو بیمہ داروں کی ملکیت ختم ہوتی ہے اب اس رقم کی مالک کمپنی ہے وہ چاہے اپنی رقم سے تبرع کرے چاہے نہ کرے کارخیر میں حصہ لے نہ لے ۔ لیکن اگر دوسری صورت ہے تو کمپنی اس رقم کی مالک نہیں ہے محض وکیل کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس رقم کے مالک وہ بیمہ دار ہیں کیونکہ مسئلہ یہی ہے کہ اگر زید نے عمرو کو مثلاً سو روپے دیئے کہ کوئی مریض نادار ہو تو آپ میری طرف سے اس رقم سے دوا خرید کر اسکو دے دیں ۔ اس صورت میں اس سو روپیہ کی ملکیت زید کی ہے ۔ عمرو وکیل کے پاس بطور امانت ہے جب تک وہ مریض کو دوا خرید کر حوالہ نہ کرے اس وقت تک سو روپے کی ملکیت اسی طرح

زید کی رہے گی اس لئے اگر کسی وجہ سے زید کو خیال آیا کہ میں کسی مریض پر خرچ نہیں کرنا چاہتا یا اس کو خود مالی ضرورت پیش آئی تو وہ عمرو سے کہہ سکتا ہے کہ میرے سو روپے مجھے واپس کر دو۔ عمرو نہیں کہہ سکتا کہ ایک دفعہ جو مریض کی دوا کیلئے دیئے ہیں تو اب میں واپس نہیں دوں گا ۔ اب یا تو میں کسی مریض کو دوں گا یا خود رکھوں گا تجھے واپس لینے کا حق نہیں ہے۔ اس مثال کو پیش نظر رکھ کر کسی مصیبت زدہ کے نقصان کی تلافی کرنے سے قبل بیمہ داروں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کمپنی سے کہیں کہ ہمیں خود ضرورت پیش آئی ہے ہم نے جو چھ ماہ قبل آپ کو پانچ ہزار دیئے تھے وہ واپس کر دیں. لیکن کیا یہ بیمہ دار قانون معاہدہ کی رو سے اپنی وہ دی ہوئی رقم جو تبرعاً خرچ کرنے کیلئے دی تھی واپس لے سکتے ہیں ۔ امر واقعہ یہ ہے کہ واپس نہیں لے سکتے ۔ اگر ان بیمہ داروں میں سے کسی کا نقصان ہوا تو جبراً وہ تو بناء بر قانون بیمہ پورا کریں گے ان کا نقصان نہ ہوا تو پانچ ہزار خود بخود کمپنی کے ہوگئے ۔ الغرض ۵ ہزار کمپنی کو دے کر دکان میں آگ لگنے کی صورت میں ۲۵ ہزار لینا سود ہی ہے اس کی کوئی توجیہہ و تاویل نہیں کی جا سکتی ۔ البتہ اس میں سود کو نقصان پر معلق رکھا ہے جب نقصان ہو گیا تو سود متحقق ہو گیا ۔ تو آگ لگنے کی صورت میں اس بیمہ دار کو ۵ ہزار قرض دینے پر ۲۰ ہزار روپیہ مزید سود مل جاتا ہے اور یہ قمار بھی ہے کہ ۲۵ ہزار بیمہ دار کو دینا آگ لگ جانے کی صورت میں اور ۵ ہزار کمپنی کو آگ نہ لگنے کی صورت میں طے ہوا تھا اور کسی واقعہ کے وقوع یا عدم وقوع پر ہار جیت کا نام قمار ہے۔ آگ لگ گئی تو بیمہ دار نے جوا جیت لیا ۔ ۵ ہزار داؤ پر

لگائے تھے ۲۵ ہزار لے لئے آگ نہ لگی کمپنی جیت گئی ۔ ۲۵ ہزار داؤ پر لگائے تھے ۵ ہزار مفت مل گئے ۔ البتہ کمپنی کی جیت کی صورت میں صرف قمار ہے سود نہیں ہے کیونکہ اس نے کچھ اس سے کم رقم بیمہ دار کو قرض نہیں دی تھی بلکہ اس نے ۵ ہزار قرض رقم دی تھی جو کمپنی کی جیت کی وجہ سے اس کے ذمہ سے اتر گئی ۔ جب اس سود و قمار کو بیمے کا تقدس نام دیا گیا تو وہ دونوں اخلاقی برائیاں اس نام کے پردے میں چھپ گئیں اور ان دونوں حرام کاموں کو جائز بلکہ منشا قرآنی ثابت کرنے کیلئے ،،اہل علم و دانش،، زور لگا رہے ہیں ان حضرات سے میں ایک سادہ سا سوال پوچھتا ہوں ۔ زید نے عمرو سے کہا کہ کل صبح کو بارش ہوگی ۔ اور عمرو نے کہا کہ نہیں کل صبح کو بارش نہیں ہوگی زید عمرو سے کہتا ہے کہ اگر کل بارش نہ ہوئی جیسا کہ آپ کہتے ہیں تو ۷ بجے تا ۱۰ بجے بارش نہ ہونے کی صورت میں آپ کو میں ایک ہزار دوں گا اور اگر کل ۷ بجے تا ۱۰ بجے بارش ہوگئی جیسا کہ میں کہتا ہوں تو پھر آپ مجھے ہزار دیں گے ۔ عمرو نے بھی اس کو تسلیم کیا اور دونوں کا باہمی معاہدہ ہو گیا ۔ اب ظاہر ہے کہ کل کو بارش ہونے یا نہ ہونے کی دونوں صورتوں میں سے ایک تو ضرور ہوگی ۔ چنانچہ کل کا دن آیا ۔ تو ۸ بجے تا ۹ بجے بارش ہوگئی زید کی شرط پوری ہوگئی اور اس معاہدہ کے مطابق زید نے عمرو سے وہ ایک ہزار لے لئے گویا زید جیت گیا ۔ یا کل کا دن آیا تو ۷ بجے سے ۱۰ بجے تک موسم بالکل خشک رہا آسمان صاف تھا ۔ عمرو کی شرط پوری ہوئی تو حسب وعدہ زید کو ہزار روپے دینے پڑے وہ ہار گیا عمرو جیت گیا تو بتائیے کہ زید و عمرو کا یہ معاہدہ اور شرط کے وقوع پذیر ہونے نہ ہونے پر ہار جیت

قمار ہے یا نہیں ۔ اگر یہ قمار ہے تو ذرا فرق بتا دیجیئے کہ آگ لگ جانے اور نہ لگ جانے کی صورت میں بیمہ دار کو رقم ملنا اور نہ لگ جانے کی صورت میں کمپنی کو رقم ملنا کیا بالکل اس طرح کی صورت نہیں ہے۔ یقیناً دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہاں آپ اتنا فرق بتا سکیں گے کہ بیمہ دار تو ۵ ہزار ہارتا ہے اور کمپنی ۲۵ ہزار ہارتی ہے۔ لیکن اس فرق کی وجہ سے حرمت قمار میں فرق نہیں پڑتا ۔ اگر زید کہے کہ بارش نہ ہوئی تو میں ہزار روپیہ تجھے دوں گا اور بارش ہوگئی اور میں جیت گیا تو آپ مجھے مثلاً آٹھ سو روپیہ دیں گے تب بھی وہ قمار ہوگا ۔ جانبین میں رقم کی مقدار کی کمی بیشی سے قمار کے تحقق اور حرمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں آپ تبرع والی بات ہرگز نہیں کہہ سکتے کیونکہ بارہا عرض کر چکا ہوں کہ نہ بیمہ دار تبرع کرتا ہے اور نہ کمپنی ۔ قانونی طور پر دونوں پابند ہو جاتے ہیں اور نہ دونوں طرف کی نیت میں تبرع ہوتا ہے۔

تبرع کی تعریف فقہائے کرام نے یوں کی ہے۔ التبرع ہو اعطاء الشئی غیر الواجب اعطاءہ احساناً من المعطی و روح التبرع ان لایکون الواھب مجبراً علی اداء شئی لیس بمجبر علی ادائہ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج ۱ ص ۵۱)

تبرع یہ ہوتا ہے کہ کسی کو ایک ایسی چیز دی جائے جس کا دینا اس پر واجب و لازم نہیں تھا اور صرف اس لئے دیتا ہے کہ دینے والا اس لینے والے کے ساتھ احسان کرتا ہے اور تبرع کی روح یہ ہے کہ وہ چیز بخشنے والا شخص کسی ایسی چیز کے ادا کرنے پر مجبور نہ کیا جائے جس کے ادا کرنے پر وہ دراصل مجبور نہیں تھا ۔ یعنی کسی قسم کے بھی جبر کے بغیر وہ محض اپنی خوشی سے دے رہا ہے۔

خدا را سوچا جائے کہ بیمہ کے معاہدہ کے بعد کتنی قانونی مجبوریوں میں دونوں باندھے جاتے ہیں اور ان کی آزاد مرضی ختم ہو جاتی ہے اس قدر قانونی اجبار کے بعد بھی اس لین دین کو تبرع کہنا یا تو نری جہالت ہے یا جان بوجھ کر سینہ زوری اور ,, میں نہ مانوں ،، کی بے جا رٹ ہے۔

بیمہ میں اس ہار جیت کو قمار اور شرعاً ممنوع نہ ہونے کی ایک عجیب و غریب وجہ اختراع کی گئی ہے اور اس ,, ذہانت ،، کی داد دینی چاہیئے۔ کہا گیا ہے کہ ,, قمار ایک کھیل ہوتا ہے اور بیمہ ایک کھیل کے طور پر نہیں کھیلا جاتا ،، ۔ اردو زبان میں محاورہ ہے۔ جوا کھیلنا ۔ یا فارسی میں کہا جاتا ہے قماری بازی ۔ اس سے ہمارے محترم مقالہ نگار نے یہ نکتہ نکالا کہ کھیلنا قمار کے شرعی مفہوم میں بھی داخل ہے۔ لہذا جو ہار جیت ایک کھیل کھیلنے کی صورت میں ہو تو وہ ناجائز ہو گا اور اگر پوری سنجیدگی اور باوقار طریقہ کے ساتھ محض قسمت کے بل پر داؤ لگ کر مال کی کمائی کے ارادے سے یہ ہار جیت ہو تو پھر وہ ناجائز نہیں وہ قمار نہیں اور چونکہ بیمہ میں ہر فریق مال حاصل کرنے کی غرض سے یہ قسمت آزمائی کر رہا ہے اور بہت مہذب اور سنجیدہ طریقے سے یہ کر رہا ہے تو یہ جائز ہے۔ آخر مال کمانے کو کون ناجائز کہہ سکتا ہے۔ اور یہ وہی بات ہوئی کہ قرآن مجید نے جس خمر کو رجس کہا ہے اور اس سے اجتناب کا حکم فرمایا ہے یہ وہ خمر ہے جو زمانہ جاہلیت میں ان پڑھ عرب غیر سائنسی بنیادوں پر بھٹیوں میں بنایا کرتے تھے وہ خمر مضر اور جسمانی صحت کے لئے نقصان دہ تھی اور آج کل سائینٹیفک طریقوں سے نہایت صاف ستھری شراب کارخانوں میں

حفظان صحت کے اصول کے پیش نظر تیار کی جاتی ہے یہ وہ ممنوع اور رجس خمر نہیں ہے اور اس کا نام بھی تو خمر نہیں ہے اس کا تو اب نام بھی وھسکی بیئر وغیرہ ہے ۔ ایسی نکتہ آفرینیوں سے محرمات شرعیہ کو حلال قرار دینے سے ممکن ہے ھوا و ھوس کے بندوں اور نفس پرستوں کو ایک بہانہ ھاتھ آ جائے اور وہ اس کو قبول کرکے محرمات کے ارتکاب پر دلیر و بے باک ھو جائیں لیکن ان سے ایک حقیقت واقعۃً بدل نہیں سکتی ۔ وہ حرام عنداللہ حرام ھی رھے گا ۔ ایسی تاویلوں سے حرام کا استحلال نہایت خطرناک صورت حال پیدا کر سکتا ہے ۔ اعاذنا اللہ منہ ۔ نیز بیمہ کی قمار سے نکالنے کیلئے حرمت قمار کی ایک علت از خود نکالی گئی ہے اور کہا ہے کہ قمار کی حرمت کی اصل وجہ تو یہ ہے کہ وہ آپس میں عداوت و بغضاء کا ذریعہ بنتا ہے اور ذکر اللہ اور اقامت صلوٰۃ سے روکتا ہے اور چونکہ بیمہ دار اور کمپنی ذکر اللہ اور نماز سے غافل نہیں ھو جاتی لہذا یہ بیمہ کی ھارجیت قمار نہیں ، کیونکہ کسی حکم کیلئے جو علت ھو تو علت کے وجود کے ساتھ حکم ھوتا ہے اور علت نہ ھو تو حکم بھی نہیں ھوتا ۔ اس بحث میں تو ھم نہیں پڑتے کہ عموماً آج کل کے بیمہ دار اور کمپنی ذکر اللہ اور اقامت صلوٰۃ کے کس قدر پابند ھوتے ھیں اور ان کی غفلت و بے پرواھی کتنی ھوتی ہے کیونکہ کہا جا سکتا ہے کہ احکام شرعیہ سے ان کی یہ سرکشی بیمہ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ایسے لوگ تو بیمہ نہ بھی کریں تب بھی اسی طرح غافل اور احکام شرعیہ کے تارک ھوتے ھیں ۔ ھم صرف یہ عرض کریں گے کہ میسر و خمر دونوں کی حرمت کیلئے یہ علت نہیں ۔ ذکر اللہ اور نماز سے روکنا حکمت حرمت ہے خمر میں تو خود مقالہ نگار نے ذکر اللہ اور

نماز سے غفلت کو حکمت قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ خمر میں علت حرمت اس کا اِسکار ہے۔ میسر و خمر دونوں کا ذکر ایک آیت میں ہے۔ انما یرید الشیطن ان یوقع بینکم العدوة والبغضاء فی الخمر و المیسر ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلوة : ایقاع عداوت و بغضاء اور صد عن ذکر اللہ وعن الصلوة دونوں کیلئے ایک ساتھ۔ ارشاد فرمایا ہے تو مقالہ نگار نے دونوں میں یہ فرق کہاں سے نکالا ہے کہ خمر کیلئے تو اس کو حکمت حرمت کہا اور علت اور نکالی اور قمار و میسر کے لئے اس کو علت قرار دے کر اس پر پھر ازخود یہ تفریع کر دی کہ جس میسر (ہار جیت کر کمانے) میں یہ علت نہ ہو جیسا کہ بیمہ میں ہے تو پھر وہ حلال ہے حرام نہیں ہے۔اس فرق کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ خوش قسمتی سے مقالہ نگار کی آزاد خیالی اب تک اس حد کو نہیں پہنچی کہ وہ خمر کو بھی کسی تاویل و توجیہ سے حرام کے بجائے حلال قرار دیں۔ اور ابھی تک اس کا ذہن خمر کی حرمت کا قائل ہے تو اس کے لئے مجبوراً یہ فرق ازخود نکالا ہے۔

لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ جس طرح اس نے بیمہ کے قمار کو حلال کرنے کیلئے آیت قرآنی میں مذکور باتوں کو علت حرمت قرار دے کر کہا کہ بیمہ کی صورت میں نہ باھمی عداوت ہوتی ہے نہ بیمہ ذکر اللہ اور صلوٰۃ سے کسی کو روکتا ہے لہذا علت حرمت منتفی ہے تو حرمت کا حکم بھی منتفی ہے۔ تو خمر کو حلال کرنے والا بھی اسی طرح کہہ سکتا ہے کہ خمر کی حرمت کی علت یہی امور ہیں۔ لہذا اگر شراب پی جائے اور پینے والوں میں باھمی عداوت پیدا نہ ہو ایسے وقت پی جائے کہ نماز کا وقت آئے تو نشہ اتر چکا ہو اور یہ شخص ہوش و حواس کے ساتھ نماز پڑھ سکے اور ذکر کر سکے اور یہ علت

منتقی ہو تو پھر ایسی شراب پینا پلانا بھی جائز ہے۔ یہ جو آج کل ہمارے اس نئے دور کے ,, مجتہدوں ،، میں جو مغرب کے مقلد محض ہیں یہ بیماری عام طور پر پھیل گئی ہے کہ وہ اپنے طور پر منزلی ذہن سے ہر حکم شرعی کیلئے ایک علت ازخود متعین کر دیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ جہاں یہ علتِ نہیں ہے وہاں یہ حکم شرعی بھی نہیں ہوگا اور اس طرح خود ساختہ تعلیلات کے ذریعہ دینی احکام پر تیشہ چلاتے رہتے ہیں تو اس دور میں دین کیلئے یہ سب سے بڑی مصیبت اور تحریف دین کا ایک مہلک و خطرناک ذریعہ ہے اور درحقیقت یہ وہی یہودی ذہنیت ہے کہ انہوں نے اس قسم کے حیلوں بہانوں سے تورات کے تمام شرعی احکام کے نظام کو تہہ و بالا کرکے خواہشات نفسانی کے مطابق کر دیا تھا۔ یحرفون الکلم عن مواضعہ کی تفسیر میں ان کا جو ,, کارنامہ ،، بتایا گیا ہے اس میں جس طرح تحریف لفظی شامل ہے۔ اس سے بہت زیادہ مقدار میں اس قسم کی تحریف معنوی بھی ہے۔ جناب عرفانی صاحب کو میں ,, مجتہدین ،، کے اس قسم کے گروہ میں نہیں سمجھتا مگر اتنا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں غیر شعوری طور پر اس قسم کے مجتہدین سے کچھ متاثر ہوئے ہیں۔ یا محض ان کی ,, وکالت ،، کر رہے ہیں خود ان کا اپنا ذہن اس حد تک پہنچا ہوا نہیں ہے۔

مقالہ نگار نے خمر میں حرمت کی علت اس کا مخامرہ عقل اور سکر کو قرار دیا ہے۔گویا خود لفظ خمر ہی کے مفہوم میں جو کچھ پایا جاتا ہے اور جس کی تفسیر و توضیح ارشاد نبویؐ کل مسکر حرام میں کی گئی ہے وہی علت حرمت ہے۔ تو اسی طرح لفظ میسر اور لفظ قمار ہی میں علت حرمت موجود ہے اور احادیث میں اس کی

توضیح کی گئی ہے۔ اہل لغت یہ کہتے ہیں کہ لفظ میسر کا اصل مادہ یسر ہے۔ اس کے حروف اصلی یا سین را ہیں۔ یسر کے معنی ہیں سہولت وآسانی اور اگر کوئی کام کسی محنت ومشقت کے بغیر کیا جائے تو اس قمار کو یسر یا میسر اسلئے کہا جاتا ہے کہ ایک شخص کسی قسم کی محنت و مشقت اور بدنی اور ذہنی قوی کو استعمال میں لائے بغیر محض قسمت کے سہارے اور اتفاقاً داؤ لگنے پر اعتماد کرکے اکتساب مال کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اس میں ہارنے کی نیت کسی بھی فریق کی نہیں ہوتی ہارنے والی صورت اس کو طبعاً انتہائی ناگوار اور مبغوض ہوتی ہے اس کی نظر صرف جیت پر ہوتی ہے اور اس کو بلامشقت آسانی کے ساتھ کمائی کا ایک ذریعہ سمجھ کر اس میں حصہ لیتا ہے اکتساب مال کا ایسا طریقہ اختیار کرنا اسلامی مزاج کے خلاف ہے اور لاٹری وغیرہ کی مختلف شکلیں جو آج کل عام طور پر پھیل رہی ہیں وہ سب اس میسر میں شامل ہیں۔ مگر بدقسمتی سے آج کل پاکستان میں ساری تجارت اسی قسم کی جوا بازی کی نذر ہے اور ہر تجارت کو جوا بنایا گیا ہے۔ اقبال مرحوم نے درست فرمایا تھا۔

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات

درحقیقت اس ذہنیت سے معاشرہ میں بہت سی اخلاقی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور اجتماعی طور پر ملک کی معیشت کا نظام متوازن اور عادلانہ نہیں رہتا۔ یہ یسر کے ساتھ محض قسمت کی یاوری سے اکتساب مال کا جذبہ محرکہ علت حرمت ہے اور بیمہ میں یہی کچھ پیش نظر ہوتا ہے۔ اس کو قمار بھی کہا جاتا ہے۔ لغت میں

قمار اور مقامرہ کے معنے ہیں مغالبہ یعنی دو شخصوں میں اس طرح مالی مقابلہ ہو کہ ہر ایک یہ سوچے اور اسی دھن میں ہو کہ محض قسمت کے سہارے میں اس دوسرے پر غالب آ کر اس سے مال حاصل کروں اور دوسرا بھی یوں سوچتا ہے کہ میری خوش قسمتی ہو اور ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ میں اس دوسرے کا مال لے سکوں۔ بس ایک دوسرے سے اس مغالبہ کی صورت میں کسی واقعہ کے ظہور پذیر ہونے یا نہ ہونے پر مال حاصل کرنا قمار ہے۔ اور یہی مغالبہ کی ذہنیت دراصل قمار کی حرمت کی علت ہے اور مغالبہ کی اس ذہنیت اور اس جذبہ محرکہ کی وجہ سے بطور نتیجہ معاشرہ میں بہت سی خرابیوں کے ساتھ ساتھ باہمی عداوت بھی پیدا ہوتی رہتی ہے اور ذکر اللہ اور صلوٰۃ سے غفلت بھی ہو جاتی ہے۔ اگر قمار کے ساتھ یہ بغض و عداوت نہ بھی ہو تب بھی قمار حرام ہی ہوگا۔ اور بیمہ کی بہت سی صورتوں میں اس میسر اور قمار کی حقیقت پائی جاتی ہے اور علت حرمت موجود ہے لہذا بیمہ کو حرام کہا جائے گا اس کو تعاون و تکافل اور تحفظ جائداد وغیرہ ناموں سے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان ھی الا اسماء سمیتموھا ما انزل اللہ بھا من سلطان۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔ مقالہ نگار کو علماء کرام سے یہ شکایت ہے کہ وہ ہر معاملہ کو فقہ کی چار دیواری میں لانے کی کوشش کرتے ہیں اور جب وہ اس چاردیواری میں اندر داخل نہیں ہو سکتا تو اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ مگر خود انہوں نے بھی یہی کام کرنے کی کوشش کی ہے کہ بیمہ کے اس معاملہ کو فقہ کی چاردیواری میں لے آئے اور اسکو جائز ثابت کرلیا۔ مگر افسوس کہ وہ جواز کیلئے بیمہ کو فقہی قواعد میں سے کسی قاعدہ کی

چاردیواری میں داخل نہ کرسکے اور جو کوشش بھی کی ہے ناکام کوشش ہے۔

مثلاً فقہی قاعدہ ہے۔ الضرر یزال۔ مقالہ نگار فرماتے ھیں کہ بیمہ دار کی دکان کو آگ لگ گئی سامان جل گیا اس کو ضرر پہنچا تو اس ضرر کا ازالہ ھونا چاھیئے اور ازالہ یوں ھوگا کہ کمپنی اس کو مقررہ کردہ رقم بہ طور تاوان دیدے۔ حالانکہ جن فقہاء کرام نے یہ فقہی قاعدہ بیان کیا ہے ان کا مطلب تو یہ تھا کہ جس کسی شخص نے دوسرے شخص کو کوئی ضرر پہنچایا اور اس کو ضرر پہنچانے کا حق نہیں تھا۔ تو اس ناحق ضرر پہنچانے والے سے اس متضرر شخص کے لئے تاوان لیا جائے اور اس کے ھاتھوں پہنچائے ھوئے نقصان کی تلافی کی جائے۔ یہ مطلب اس کا ھرگز نہیں ہے کہ ضرر تو زید کو مثلاً عمرو نے پہنچایا ہے یا اس کو ضرر خود اپنے کسی عمل سے پہنچا ہے اور اس کا تاوان بکر پر لازم ھو۔ اور بکر کو قانوناً مجبور کیا جائے کہ وہ اس نقصان کی تلافی کرے۔ اسی طرح اگر دکان کو آگ عمرو نے لگائی ہے یا خود زید کی کسی بے احتیاطی سے آگ لگ گئی ہے تو بکر کو پکڑا جائے کہ جتنا نقصان ھوا ہے یہ تم پورا کرو۔ حتیٰ کہ اگر بکر نے زید سے کہا بھی ھو کہ مجھے ھزار روپیہ قرض دے دو۔ تیرا کوئی نقصان ھو جائے تو سارا نقصان میں برداشت کروں گا یا قرض لئے بغیر یہ کہا ھو دونوں صورتوں میں آگ لگنے سے نقصان ھو جانے کی صورت میں قانونی طور پر اس سے تاوان نہیں لیا جا سکتا۔ ھاں اگر ثابت ھو جائے کہ آگ عمرو نے لگائی ہے تو قانونی طور پر اس سے نقصان کا تاوان لیا جائے گا۔ الضرر یزال کا یہی مطلب ہے۔ مجلہ میں جہاں یہ فقہی قاعدہ لکھا ہے اس کی شرح

میں شارحین مثلاً صاحب دررالحکام نے اور دوسرے شراح نے جتنی بھی اس کی مثالیں دی ہیں ان میں کوئی مثال بھی اس قسم کی نہیں - جس قسم کے ضرر کے ازالہ کا ذکر مقالہ نگار نے کرکے الضرر یزال کے تحت بیان کیا ہے۔

مقالہ نگار نے یہ ثابت کرنے کیلئے کہ ہر زمانہ میں نئی صورتیں تجویز کی جا سکتی ہیں - بیع بالوفاء کے جواز کا بھی ذکر کیا ہے کہ فقہاء کرام نے سود کی حرمت سے بچنے کیلئے بیع بالوفاء کا ایک نیا جائز طریقہ نکالا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ مثال غلط دی ہے یا تو بیع بالوفاء کے بارے میں خود مضمون نگار کو پوری علمی تحقیق نہیں ہے اور اس کی شرعی حقیقت معلوم کرنے کیلئے مستند فقہی کتابوں کا انہوں نے مطالعہ نہیں کیا - بس سنی سنائی بات لکھ دی اور یا قصداً غلط فہمی میں ڈالنے کے لئے بیع بالوفاء کے جواز کا غلط حوالہ دے دیا - رد المختار شامی میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے کہ یہ بیع نہیں بلکہ یہ رھن ہے اور انتفاع بالمرھون جائز نہیں وہ ربوٰ میں شامل ہے اس کو بیع نام رکھ دینے کے باوجود رھن کی حقیقت باقی رہے گی اور اس شخص کا جس نے اپنے آپ کو مشتری قرار دیا ہے اس مرھونہ چیز سے نفع حاصل کرنا ربوٰ ہے اور دیانۃً ناجائز ہے۔ اگر مجلۃ الاحکام پیش نظر ہوتا تو جہاں اور فقہی قواعد وہاں سے نقل کئے گئے ہیں اگرچہ ان کا استعمال بے موقع کیا گیا ہے تو وہاں مجلہ میں یہ عبارت بھی سامنے ضرور آ جاتی - قاعدہ ۳ العبرۃ فی العقود للمقاصد والمعانی لاللالفاظ والمبانی ولذایجری حکم الرھن فی البیع بالوفاء (درر الحکام ج۱ ص ۱۸)

معاملات میں اصل اعتبار معاملہ کرنے والوں کے مقاصد اور معانی کا کیا جائے گا-محض الفاظ اور ظاھری عبارت کا نہیں اس لئے بیع

بالوفاء کا حکم رھن کا ہے صفحہ ۱۰ پر مجلہ کی دو عبارتیں نقل کرکے ان سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ کسی ایسے امر کے وقوع یا عدم وقوع پر تبرع کی تعلیق کرکے وعدہ کرنا شرعاً لازم ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر بیمہ کمپنی یہ وعدہ کرتی ہے کہ آگ اگر لگ گئی تو کمپنی مثلاً ۲۰ ہزار دے گی شرعاً جائز ہے قمار نہیں ۔ یہاں بھی مجلہ کی عبارتوں کو سمجھا نہیں گیا یا قصداً ان کا غلط استعمال کیا گیا ہے۔ مجلہ کی اس عبارت کی تشرح میں صاحب دررالحکام اور دوسرے شارحین نے اس کی مثال یوں دی ہے کہ ایک شخص مثلاً زید خالد سے کہے کہ آپ اپنی یہ مملوکہ چیز رشید کے ہاتھ فروخت کر دو ۔ خالد کو یہ خطرہ ہے کہ میں فروخت کروں گا تو رشید ایک نادھند شخص ہے مجھے اس چیز کا ثمن ادا نہیں کرے گا ۔ ٹال مٹول کرکے پریشان کرے گا ۔ تو زید نے خالد سے کہا کہ بے شک فروخت کرو اور اگر رشید نے ثمن ادا نہیں کیا انکار کیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ پھر میں ادا کروں گا ۔ تو زید کا یہ وعدہ بہ صورت تعلیق ہے۔ چنانچہ خالد نے وہ اپنی چیز مثلاً ایک ہزار روپیہ پر رشید کے ہاتھ فروخت کر دی اور وہ چیز اس کو دے دی اس اعتماد پر کہ زید نے ثمن ادا نہ کرنے کی صورت میں مجھے ثمن دینے کا وعدہ کیا ہے۔کچھ دنوں کے بعد خالد نے رشید سے ثمن کا مطالبہ کیا ۔ تو رشید نے انکار کیا ۔ جب اس نے انکار کیا اور ثمن ادا نہ کرنے کی وہ شرط وجود میں آ گئی ۔ تو خالد زید کے پاس آیا اور کہا کہ رشید نے تو ثمن ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ میں نے آپ کے اس وعدے کے اعتماد پر اپنی چیز اس کے ہاتھ فروخت کر دی تھی ۔ لہذا اپنے وعدے کے مطابق ایک ہزار آپ دے دیں ۔ اس کے جواب میں زید خالد کو یہ نہیں کہہ

سکتا کہ میں نے صرف اخلاقی وعدہ آپ سے کیا تھا ۔ چیز میں نے تو خود نہیں خریدی کہ ثمن میں ادا کروں ۔ اس لئے قضاءً میں اس وعدہ کو پورا کرکے ہزار روپیہ دینے کا پابند نہیں ہوں ۔ تو مجلہ کا یہ مادہ (دفعہ) یہ بتلاتا ہے کہ یہ وعدہ چونکہ رشید کے ثمن ادا نہ کرنے پر معلق ہے تو ایسی صورت میں جب معلق علیہ وجود میں آ جائے تو وعدہ پورا کرنا قضاءً بھی لازم ہوتا ہے کیونکہ یہ مجرد وعدہ نہیں ہے جو قضاءً واجب الایفاء نہیں ہوتا ۔ بلکہ ایک حق دار کو اس کا حق واجب الادا نہ پہنچنے کی صورت میں خود ادا کرنے کا وعدہ ہے ۔ اس مثال سے واضح ہوتا ہے کہ بائع خالد کا ایک حق رشید کے ذمہ واجب الاداء ہو گیا تھا ۔ اس حق واجب کے رشید سے وصول نہ ہو سکنے کی صورت میں زید نے خود ادا کرنے کا حق دار کو اس کا حق پہنچانے کا وعدہ تھا چونکہ رشید سے خالد کا حق وصول نہ ہو سکا اسلئے زید کا وہ وعدہ قضاءً واجب الایفاء اور لازم ہے تاکہ خالد کا حق مارا نہ جائے اور وہ اپنے جائز حق سے محروم نہ ہو جائے ۔ مجلہ کی اس عبارت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پہلے سے کسی کے ذمہ کوئی حق واجب الاداء نہیں تھا اور ایک شخص نے ایک امر مبہم علی خطر الوجود والعدم پر معلق رکھا کہ اگر فلاں کام ہو گیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو اتنی رقم دوں گا ۔ اور وہ کام ہو گیا ۔ معلق علیہ وجود میں آ گیا تو اب محض اس وعدے کی بنا پر شرعاً عند القضاء اس شخص پر اتنی رقم کے واجب ہونے کا حق ثابت ہو جائے گا ۔ دکان کے بیمہ کی صورت میں کمپنی کے ذمہ تو اس بیمہ دار کی یا تو اتنی رقم واجب الادا تھی جس قدر اقساط اس نے داخل کئے تھے ۔ مثلاً دو ہزار روپیہ دیئے تھے اگر آپ اس کو بیمہ دار کی طرف سے

کمپنی کے ذمہ قرض قرار دیں یا کمپنی کے ذمہ سرے سے بیمہ دار کی کوئی رقم واجب الادا تھی ھی نہیں اگر آپ نے اس کو بیمہ دار کا تبرع اور عوض کے بغیر ھبہ قرار دیا ھو۔ اس صورت میں جب کمپنی وعدہ کرتی ہے کہ اگر آپ کی دکان کو آگ لگ گئی تو میں ۲۰ ھزار ادا کروں گی ۔ حالانکہ اقساط کی رقم صرف دو ھزار جمع ھو گئی تھی یا کمپنی کے ذمہ کوئی رقم تھی نہیں اور وہ ۲۰ ھزار کا وعدہ کرتی ہے۔ تو گویا آگ لگنے پر ۱۸ ھزار غیر واجب الادا یا ۲ ھزار غیر واجب الادا کا وجوب اپنے ذمہ معلق کر رھی ہے تو شرعاً یہ مجرد وعدہ ہے اور اس تعلیق سے معلق علیہ کے وجود کی صورت میں بھی یہ وعدہ قضاً واجب الایفاء ھرگز نہیں اور مجلہ کی اس عبارت کا اس صورت کے ساتھ کوئی تعلق ھی نہیں ہے ۔ اگر آپ اس کی یہ توجیہ کریں کہ یہ اپنے ذمہ ۱۸ ھزار یا ۲۰ ھزار کے واجب کرنے کا وعدہ نہیں ہے۔ بلکہ وعدہ یوں کر رھا ہے کہ آگ لگ گئی تو میں اتنی رقم ھبہ کروں گا یعنی ھبہ کرنے اور تبرع کرنے کا وعدہ کر رھا ہے لیکن یہ مجرد وعدہ ہے اور یہ وعدہ بھی درحقیقت کسی انسانی یا اسلامی ھمدردی کی بناء پر نہیں ہے بلکہ یا تو ۲ ھزار قرضے کی وجہ سے ہے اور قرضے کی بناء پر خواہ ھبہ کے نام سے ھو اصل قرضہ کی رقم سے زائد دینے کا وعدہ غیر شرعی ہے اور اگر اس بناء پر ہے کہ اس نے تبرع کیا تھا (حالانکہ بیمہ دار تبرع نہیں کرتا وہ تو نقصان کی صورت میں زائد رقم ملنے کی توقع پر مالی محبت کی بناء پر قسطیں دے رھا ہے یا یک مشت رقم دی ہے) تو تبرع پر کسی کو قضاءً مجبور نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن آگ لگ جانے کی صورت میں بیمہ کے قانون کی رو سے عدالت کے ذریعے یہ بیمہ دار کمپنی سے ۲۰ ھزار کی

رقم لے سکتا ہے تبرع کا وعدہ خواہ معلق ہو یا غیر معلق بہرصورت قضاءً لازم نہیں ہوتا ۔ اور ایسے وعدے کی بناء پر وعدہ کرنے والے کے ذمہ کوئی مالی وجوب نہیں آ سکتا ۔ اس لئے مجلہ کی یہ فقہی عبارت نقل کرکے اس کو دلیل بنانا اور اس کی بنیاد پر بیمہ کمپنی کے ادا کردہ مال کو جو یقیناً قمار اور سود کی شکل میں آئے جائز اور حلال قرار دینا بالکل غلط ہے ۔

ہمارا نظریہ تو یہ ہے کہ بیمہ کمپنی خواہ اپنے کسی خالص حلال کی کمائی سے بیمہ دار کے قرضے پر اس قرضے کی وجہ سے زائد رقم دیدے تو وہ سود ہوگا ۔ اس تاویل سے کہ بیمہ کمپنی بیمہ دار کی قسطیں قرضہ لے کر کسی سودی کاروبار میں نہیں لگاتی بلکہ جائز کاروبار میں لگاتی ہے ۔ بیمہ کا کاروبار ہرگز جائز نہیں ہو سکتا ۔ اس لئے مقالہ نگار نے جو کسی کے جواب میں لکھا ہے کہ یہ چونکہ قرضے کا معاوضہ نہیں تبرع ہے اس لئے تین وجوہ سے سود نہیں بنتا ص ۱۸ یہ صحیح نہیں کیونکہ یہ بات تو ہم پہلے تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں کہ یہ رقم جو کمپنی قانونی جبر کے طور پر دیتی ہے وہ تبرع ہرگز نہیں ہے ۔ یقیناً معاوضہ ہے اور یہ زائد رقم جہاں سے بھی دی جائے وہ بہرحال سود ہے لیکن ساتھ ہی مضمون نگار نے ایک عجیب غیر فقیہانہ بات یہ لکھی ہے ۔ ,, لیکن اگر اسے معاوضہ ہی سمجھا جائے تو بھی معاوضہ میں اس طرح کی ادائیگی (اس کے مآخذ سے قطع نظر) جائز ہوتی ہے جیسے کوئی پیشہ ور فاحشہ عورت اپنا مکان بنوائے تو مستریوں اور مزدوروں کو جو معاوضہ دیا جائے گا وہ ان کیلئے جائز ہوگا ،، ص ۱۸ فقہی مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے ہاں محنت مزدوری کرے اور اس کی مقررہ طے شدہ اجرت

واجب الادا ہو تو کام لینے والا شخص ان مزدوروں کو جو اجرت ادا کرے وہ ان کے لئے بہر صورت حلال اور جائز ہے خواہ وہ مال اس شخص نے سود کے ذریعہ حاصل کیا ہو خواہ جوا یا چوری وغیرہ کے ذریعے ۔ وہ مال تو اس کے لئے حرام تھا اس کے بدلے جو چیز حاصل کی ہے وہ حرام ہے اس کا وبال اس کے ذمہ ہوگا ۔ مزدوروں نے تو محنت کرکے اس کی اجرت حاصل کی ہے ۔ اسی طرح مثلاً زید نے حامد کے ہاتھ ایک گھوڑا ہزار روپیہ پر فروخت کر دیا ۔ ہزار روپیہ ثمن اس کے ذمہ واجب الادا ہوا ۔ حامد نے سود یا جوا یا چوری وغیرہ کی کمائی سے ہزار روپیہ یہ واجب الادا اس کو دیئے تو زید کے لئے یہ ہزار روپیہ حلال ہیں ۔ اس نے تو اپنے مملوک گھوڑے کا ثمن وصول کیا ہے ۔ یہ ثمن حرام کمائی سے دیا تو یوں کہا جائے گا کہ جس طرح حامد کے لئے وہ ہزار روپیہ حرام تھا اس کے بدلے میں لیا ہوا گھوڑا حرام ہے لیکن اگر گھوڑے کے ثمن کے طور پر نہیں بلکہ یونہی تبرعاً حامد وہ حرام روپیہ زید کو دیدے ۔ ہبہ کر دے تو وہ اس کے لئے بھی حرام ہوں گے ۔ لیکن اگر زید نے حامد کو قرضہ کے طور پر آٹھ سو روپے دیئے تھے اور حامد نے اس کو ہزار روپے دیئے تو یہ درست ہے کہ آٹھ سو کے عوض میں دیئے ہوئے آٹھ سو زید کے لئے حرام نہیں وہ تو اس کو حلال مال کے بدلے مل گئے ۔ خواہ وہ آٹھ سو حامد نے سود سے کمائے ہوں یا جوئے سے ۔ لیکن یہ دو سو روپے جو زائد دے رہا ہے ۔ یہ بہرحال سود ہے خواہ وہ اس نے حلال طریقہ سے کمائے ہوں خواہ حرام طریقہ سے ۔ اس لئے وہ مسئلہ کہ معاوضہ میں جو کچھ مل جائے تو وہ بہرصورت حلال ہے ۔ یہ جب کہ وہ کسی عمل اور منفعت کی اجرت ہو یا کسی سامان کے بدلے اس کا ثمن ہو۔

نقد کے بدلے میں اس قدر نقد کے حق میں بھی یہ صحیح ہے لیکن جو زائد دے رہا ہے وہ معاوضہ تو ہے نہیں ۔ بیمہ دار نے اگر اقساط میں مثلاً دو ہزار اب تک دیئے ہیں اور کمپنی ۲۰ ہزار دے رہی ہے تو یہ ۱۸ ہزار تو کسی چیز کا معاوضہ نہیں ہے ۔ اس لئے یہ کہنا کہ معاوضہ میں ادائیگی جیسی بھی ہو وہ جائز ہوتی ہے یہاں درست نہیں کیونکہ یہ زائد رقم معاوضہ ہرگز نہیں ہے ۔ محض سود ہے خواہ یہ رقم کمپنی نے سود سے حاصل کی ہو یا اپنی حلال آمدنی میں سے دے دی ہو ۔ الربوٰ ہونے کی وجہ سے بیمہ دار کیلئے حرام و ناجائز ہے ۔

مضمون نگار نے صفحہ ۱۹ پر ایک اور عجیب بات لکھی ہے "بیمہ کو تعامل و تکافل کا عمل نہ سمجھیں تو بھی شرعاً بدلین کا بازاری قیمت کے لحاظ سے مساوی ہونا ضروری نہیں" ۔ یہ صحیح ہے کہ سونے چاندی اور کرنسی کے علاوہ اگر اشیاء غیر مکیل اور غیر موزوں ہوں اور ان کا تبادلہ کیا جاتا ہو وہاں بدلین کی بازاری قیمت میں مساوات نہ بھی ہو تو تبادلہ جائز ہے ۔ مثلاً ایک شخص کپڑے کا تھان جس کی بازاری قیمت سو روپیہ ہے دوسرے شخص کو دے رہا ہے اور اس کے بدلے اس شخص سے ایک کرسی لے رہا ہے جو بازاری قیمت کے لحاظ سے ۸۰ روپے کی ہے تو بازاری قیمت میں مساوات نہ ہونے کے باوجود یہ تبادلہ ہاتھوں ہاتھ بھی جائز ہے اور ادھار پر بھی جائز ہے اور اگر اشیاء مکیل و موزوں ہوں اور ایک جنس کا تبادلہ اسی جنس سے ہو رہا ہے مثلاً گندم کا گندم سے تو ضروری ہے کہ یہ تبادلہ وزن اور کیل کے اعتبار سے ایک برابر کی مقدار پر ہوا اور ہاتھوں ہاتھ ہو ۔ اگرچہ ایک عمدہ قسم کی گندم ہے جس کی بازاری قیمت اسی روپیہ من ہو اور دوسری معمولی قسم کی ہے جس

کی قیمت بازار میں ۶۰ روپیہ من ہو۔ مکیل و موزون اشیاء میں تبادلہ کے عنوان سے نسیہ (ادھار) درست نہیں ہوگا اگرچہ مقدار دونوں کی ایک ہو۔ اور سونے چاندی میں اور کرنسی میں یہ ضروری ہے کہ تبادلہ مساوی ہو اور ہاتھوں ہاتھ ہو۔ تو مضمون نگار کے اس جملے کا کیا مطلب کہ بدلین کا بازاری قیمت کے لحاظ سے مساوی ہونا ضروری نہیں۔ اگر مقصد وہی غیر مکیل اور غیر موزون اشیاء میں مساوات ضروری قرار نہ دینا ہے تو وہ زیر بحث نہیں اور اگر مقصد یہ ہے کہ بیمہ دار نے دو ہزار دیئے اور کمپنی نے بعد میں ۲۰ ہزار دیئے تو یہاں دونوں کا مساوی ہونا ضروری نہیں تو یہ بدایۃً غلط ہے اور کسی بھی تاویل سے اس کو شرعاً صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ورنہ جس ربوا کو مضمون نگار بھی حرام مانتے ہیں وہ بھی جائز ہو جائے گا ایک شخص نے دو ہزار دیئے اور کچھ عرصہ بعد دوسرے نے ۲۰ ہزار دیئے تو کوئی حرج نہیں۔ ,, بدلین کا بازاری قیمت کے لحاظ سے مساوی ہونا ضروری نہیں "۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کر دیا کہ ہمارے ہاں بیمہ کے عدم جواز کی بنیادی وجہ صرف یہ ہے کہ اس میں سود ہے یا سود و قمار دونوں، باقی وجوہ ضمنی ہیں۔ لیکن مقالہ نگار نے یہ ثابت کرنے کیلئے کہ عدم جواز کی جو وجوہ بیان کی جاتی ہیں وہ سب کمزور ہیں اور ناقابل التفات۔ ان دوسری ضمنی اور غیر اہم وجوہ کا بہ طور اعتراض ذکر کرکے ان کا جواب دیا ہے۔ مگر ہر جواب فقہی طور پر کمزور ہے اور فقہی اصول و قواعد کی رو سے ان جوابات کو واقعہ میں جوابات نہیں کہا جا سکتا۔ اگرچہ مقالہ نگار کو یہ شکایت ہے کہ علماء کرام خواہ مخواہ بیمہ کو ,, فقہی اصول و قواعد کی چار

دیواری،، میں لانا چاھتے ھیں اور جب یہ اس چار دیواری میں داخل نہیں ھوتا تو اس لئے اس کو ناجائز کہتے ھیں لیکن ان جوابات میں وہ خود پھر یہ ناکام کوشش کرتے ھیں کہ بیمہ کو جائز اور حلال طیب قرار دینے کے لئے اس کو ،، فقہی اصول و قواعد کی چار دیواری ،، میں داخل کریں ۔ اور اس سلسلہ میں ھر قدم پر غیر فقہی انداز اختیار کیا گیا ہے اور ان قواعد کا بیمہ پر انطباق نہایت غلط طریقہ سے کرکے ان لوگوں کو غلط فہمی میں ڈالا ہے جن کو اصل فقہی مسائل کا علم نہیں ھوتا ۔ ان سب کی اصل حقیقت بتلانے کی ضرورت ہے ۔ مگر میرا یہ مضمون کافی طویل ھو گیا اس لئے فی الحال میں اسی پر اکتفا کروں گا اور پھر کسی دوسرے مضمون میں ان باقی ماندہ جوابات کی مغالطہ انگیزی دور کروں گا ۔ واللہ ھو الموفق والمعین ۔